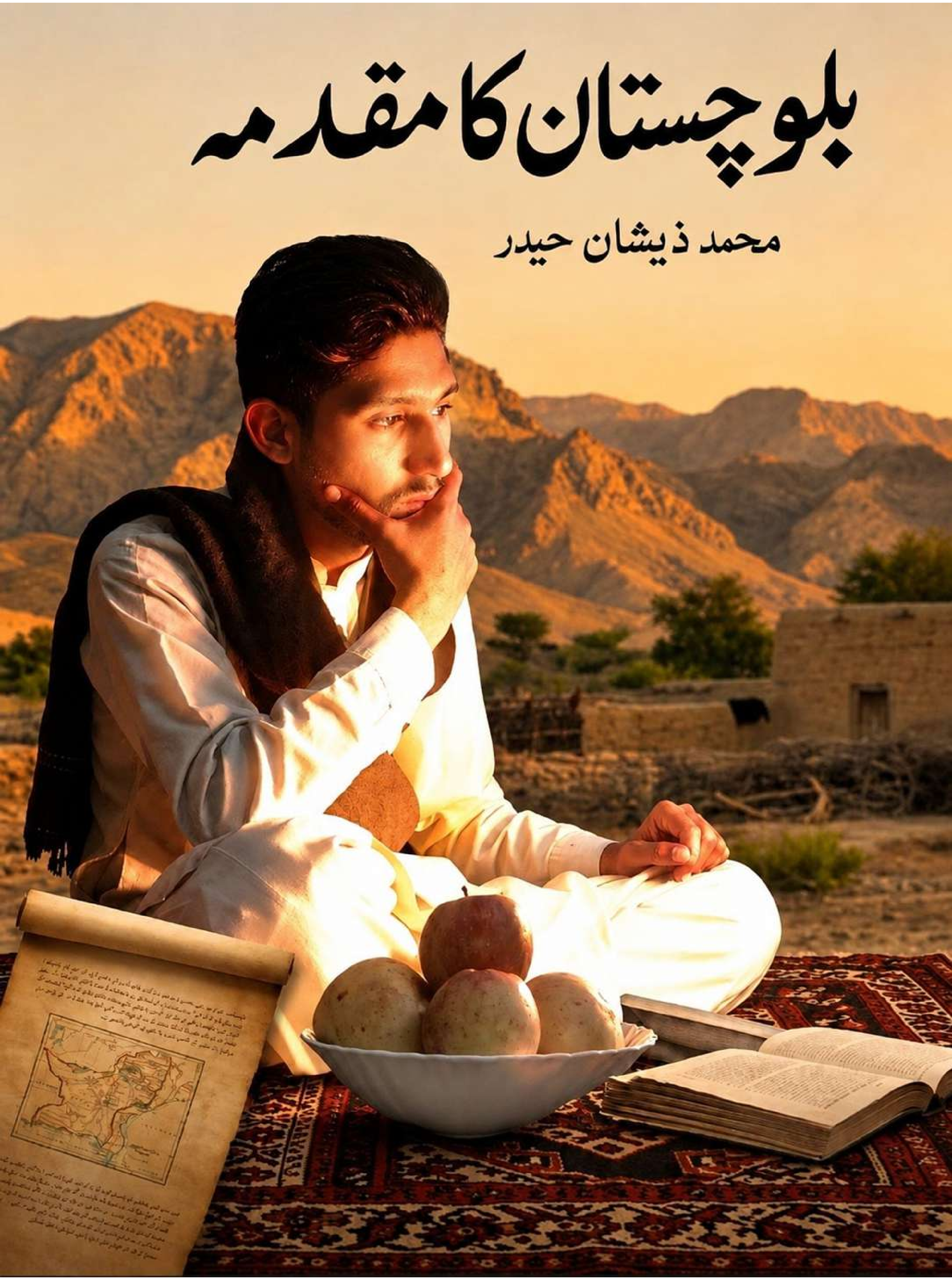
بلوچستان کا مقدمہ

محمد ذیشان حیدر



فہرستِ ابواب

پیش لفظ

کچھ مقدمے عدالتوں میں نہیں چلتے،
کچھ تاریخ کے صفحات پر لکھے جاتے ہیں،
اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو انسان اپنے ضمیر کے سامنے پیش کرتا ہے۔
ہم نے تاریخ میں بہت کچھ کھویا ہے۔
بغداد ہمارے ہاتھوں سے گیا، اندلس ہم سے چھن گیا، اور پھر ایک دن ہم نے اپنے ہی ملک کو ٹوٹتے دیکھا۔
ہم نے دیکھا کہ جب فاصلے بڑھ جائیں، شکوے خاموش رہ جائیں اور اپنے ہی لوگوں کے دل میں محرومی جڑ پکڑ لے، تو دشمن صرف سرحدوں سے حملہ نہیں کرتا، وہ دلوں کے درمیان بننے والی دراڑوں سے راستہ بناتا ہے۔
میں اس دور میں موجود نہیں تھا، مگر تاریخ کے ان زخموں کا درد ضرور محسوس کیا ہے۔
میں اس تاریخ کا عینی شاہد نہیں تھا، مگر اس کے زخموں کا وارث ضرور ہوں۔
پھر ایک دن بلوچستان کا مقدمہ میرے سامنے آیا۔
میں نے وہاں صرف ایک صوبہ نہیں دیکھا؛ میں نے اپنے ہی وطن کا ایک ایسا حصہ دیکھا جس کے پہاڑوں میں درد تھا، جس کی ماؤں کی آنکھوں میں سوال تھے، جس کے نوجوانوں کے دل میں محرومیاں تھیں، اور جس کے عام لوگ طاقت، سیاست، سرداری اور مصلحتوں کے درمیان پس رہے تھے۔
تب میرے سامنے دو راستے تھے۔
ایک راستہ یہ تھا کہ میں خاموش رہوں، اپنی ذات، اپنی سہولت اور اپنی محفوظ زندگی کو ترجیح دوں؛ آنکھیں بند کر لوں، قلم روک دوں اور یہ سوچ کر آگے بڑھ جاؤں کہ یہ میرا مسئلہ نہیں۔
اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں اپنی بساط کے مطابق اپنا سکون، اپنا وقت، اپنی سہولت اور ضرورت پڑنے پر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دوں، مگر اپنے بلوچ بہن بھائیوں کو تنہا نہ چھوڑوں۔
میں نے دوسرا راستہ چنا۔
کیونکہ میں اپنے ملک کو ایک بار پھر ٹوٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔
میں نہیں چاہتا تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دوبارہ دہرائے، کہ دشمن باہر کھڑا ہو اور ہم اندر سے ایک دوسرے سے دور ہوتے جائیں۔

اس کتاب میں میری صحافتی جستجو، مختلف لوگوں کے انٹرویوز، متاثرہ خاندانوں کی آہیں، لاپتہ افراد کے اہلِ خانہ کا درد، ریاستی اداروں کی مشکلات، قبائلی سرداری نظام، سیاسی مفادات اور بلوچستان کے وسائل سے جڑے سوالات ایک داستانی انداز میں سامنے آتے ہیں۔ مقصد کسی ایک فریق کو مکمل مجرم یا مکمل بے گناہ ثابت کرنا نہیں، بلکہ یہ سوال اٹھانا ہے کہ اس سارے بحران کی قیمت آخر کون ادا کر رہا ہے؟

اور اس سوال کا سب سے تلخ جواب ہے: عام بلوچ عوام۔

میں نے جو دیکھا، جو سنا، جن ماؤں کے آنسو دیکھے، جن نوجوانوں کی بے بسی سنی اور جن طاقتور چہروں کے پیچھے چھپی حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کی، ان سب کو ان صفحات میں ایک امانت کی طرح محفوظ کر دیا۔

یہ کتاب محرومی کے خلاف، ظلم کے خلاف، خاموشی کے خلاف اور اس سوچ کے خلاف ایک مقدمہ ہے جو اپنے ہی لوگوں کو اپنے سے دور کر دیتی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ یہ مقدمہ کہاں تک جائے گا۔

مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر آج ہم نے اپنے لوگوں کا درد نہ سنا، تو کل تاریخ ہم سے سوال کرے گی۔

اور اس سوال کے سامنے خاموش رہنا بھی ایک جواب ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنا قلم اٹھایا۔

کیونکہ کچھ مقدمے جیتنے کے لیے نہیں لکھے جاتے؛

بلکہ اپنے لوگوں کو بکھرنے سے پہلے جگانے

ضمیر کو جھنجھوڑنے، اور آنے والی نسلوں کو گواہ بنانے کے لیے لکھے جاتے ہیں

یہی بلوچستان کا مقدمہ ہے۔

پہلا باب۔۔۔۔۔۔۔ پہاڑوں کا زخمی بیٹا

لاہور کی شام ہمیشہ کی طرح مصروف تھی۔ مال روڈ پر گاڑیوں کا شور اور لوگوں کا اژدھام اپنی جگہ، لیکن "روزنامہ حرف حق" کے دفتر میں بیٹھے میرے ذہن میں ایک الگ ہی شور برپا تھا۔ میرے سامنے میز پر بلوچستان سے آنے والی چند دھندلی تصویریں پڑی تھیں۔اجڑے ہوئے گھر، سہمے ہوئے بچے اور اپنوں کے لاشوں پر بین کرتی مائیں مٹی کا وہ مقدمہ بیان کر رہی تھیں جس کی پیروی کرنے کی ہمت کوئی نہیں کر رہا تھا۔
کمرے میں حبس تھا یا شاید وہ بوجھ جو ان تصویروں نے میرے دل پر ڈال دیا تھا۔ ابھی میں نے ایک تصویر اٹھائی ہی تھی کہ ایڈیٹر صاحب کی بھاری آواز گونجی۔"ذیشان! کوئٹہ سے پھر خبر آئی ہے۔ حالات کشیدہ ہیں اور سچائی کہیں گرد میں دبی ہوئی ہے۔" انہوں نے میز پر جھکتے ہوئے میری آنکھوں میں دیکھا۔ "تم جانتے ہو وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں، لیکن اس وقت وہاں ایک ایسے قلم کی ضرورت ہے جو بکے نہ۔"میں نے تیکھی نظروں سے انہیں دیکھا اور جواب دیا، "ایڈیٹر صاحب، خطرہ تو خاموشی میں بھی ہے، اگر ہم آج نہ بولے تو کل تاریخ ہمیں مجرم کہے گی۔"ایڈیٹر صاحب نے کرسی کھینچی اور بیٹھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا، "ذیشان، یہ صرف رپورٹنگ نہیں ہے۔ وہاں تمہارا مقابلہ ان چہروں سے ہوگا جو خود کو قانون سے اوپر سمجھتے ہیں۔ وہ تمہیں خریدنے کی کوشش کریں گے، اور اگر نہ خرید پائے تو... انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اور اگر نہ خرید پائے تو مٹانے کی کوشش کریں گے، ہے نا؟" میں نے مسکراتے ہوئے اپنا قلم اٹھایا اور اسے اپنی جیب میں لگاتے ہوئے دو ٹوک لہجے میں کہا، "ایڈیٹر صاحب! میں وہاں صرف خبر ڈھونڈنے نہیں، اس مٹی کا مقدمہ لڑنے جا رہا ہوں۔"انہوں نے ایک لمبا سانس لیا اور فائل میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے، "تو پھر ٹھیک ہے۔ کل کی ٹکٹ کنفرم سمجھو۔ یاد رکھنا، ہمیں صرف سرخیاں نہیں، ان کے پیچھے چھپے وہ بھیانک چہرے چاہئیں جو اس آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔"اگلے دو دن میں نے ضروری تیاریوں اور تحقیق میں گزارے۔ میرا ذہن مسلسل ان سوالوں کے گرد گھوم رہا تھا جن کے جواب ڈھونڈنے مجھے اس سنگلاخ زمین پر جانا تھا۔دو دن بعد، میں لاہور کی رونقوں کو پیچھے

چھوڑ کر کوئٹہ جانے والی بس میں سوار تھا۔ جیسے ہی بس پنجاب کی حد عبور کر کے بلوچستان کی حدود میں داخل ہوئی، مناظر بدلنے لگے۔ ہرے بھرے کھیتوں کی جگہ سرمئی پہاڑوں نے لے لی، جو خاموشی سے مجھے دیکھ رہے تھے، جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کیا میں واقعی اس مقدمے کی پیروی کر پاؤں گا؟

بس کی کھڑکی سے باہر بدلتے مناظر میری سوچوں کی حدت کو کم کرنے میں ناکام تھے۔ جیسے جیسے بس کوئٹہ کے قریب پہنچ رہی تھی، فضا میں ایک عجیب سی گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ لک پاس کا وہ موڑ، جہاں سے پہاڑوں کا سلسلہ مزید سنگلاخ ہو جاتا ہے، وہاں پہنچتے ہی اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور پھر گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے خاموش وادی کو لرزا کر رکھ دیا۔بس کے ڈرائیور نے گھبرا کر زور سے بریک لگائی۔ مسافروں میں چیخ و پکار مچ گئی، کوئی سیٹوں کے نیچے چھپ رہا تھا تو کوئی دعا مانگ رہا تھا۔ میں نے ہمت جمع کی اور کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ سامنے سڑک پر پتھر بکھرے ہوئے تھے اور ایک کالی جیپ تیزی سے دور جا رہی تھی۔

جب فائرنگ کا شور تھما، تو میں نے بس کا دروازہ کھولا اور نیچے اترا۔ ہر طرف گرد و غبار تھا، لیکن سڑک کے کنارے، ایک پرانی چٹان کے سائے میں مجھے کوئی وجود نظر آیا۔ میں تیزی سے اس طرف لپکا۔وہ ایک قد آور جوان تھا، جس کے چہرے پر بلا کا رعب اور آنکھوں میں گہرا جلال تھا۔ اس کی کالی واسکٹ بائیں کندھے سے خون میں تر تھی، لیکن اس کے ماتھے پر شکن تک نہ تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا زخم تھاما ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی بلوچی چادر کو سہارا دے رہا تھا۔"بھائی! آپ کو گولی لگی ہے،" میں نے اس کے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کریں، میں آپ کو سنبھالتا ہوں۔"اس نے اپنی عقاب جیسی تیز نظریں مجھ پر جمائیں اور ایک سرد، بھاری آواز میں پوچھا: "پنجابی ہو؟"

میں نے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں دیکھا، جہاں درد سے زیادہ بے اعتباری تھی۔ میں نے اس کا زخمی ہاتھ تھاما اور نہایت سکون مگر پختہ لہجے میں جواب دیا: "ہاں، لیکن اس سے پہلے ایک انسان ہوں اور تمہارا بھائی ہوں۔ میرا نام محمد ذیشان حیدر ہے۔"میرے لہجے کی سچائی شاید اس کے دل کے کسی بند دروازے پر دستک دے گئی۔ اس کے چہرے کی سختی مٹھی بھر کم ہوئی اور اس نے ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا سر چٹان سے ٹکا دیا۔

"میں شاہ میر بلوچ ہوں،" اس نے دھیمی مگر رعب دار آواز میں اپنا تعارف کرایا۔ اس کے چہرے پر موجود گرد اور پسینے کے قطرے اس کی تکلیف کا پتہ دے رہے تھے، مگر وہ ضبط کا پہاڑ بنا بیٹھا تھا۔

"تم مسافر لگتے ہو،" اس نے اکھڑی ہوئی سانسوں کے درمیان دھیمی آواز میں کہا۔ "اس آگ میں کیوں کود رہے ہو؟ یہاں تو اپنے اپنوں کو نہیں پہچانتے۔"

میں نے بیگ سے پانی کی بوتل نکالی اور اسے پلاتے ہوئے کہا، "پہچان تب ختم ہوتی ہے جب انسان سچ بولنا چھوڑ دے۔ میں ایک لکھاری ہوں، اور میرا کام ہی پہچان کروانا ہے۔" اس نے پانی کے دو گھونٹ بھرے اور کچھ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "لکھاری؟" اس نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ "تو کیا تم اس مٹی کی چیخیں لکھ سکو گے؟ یہاں کے پہاڑ گواہ ہیں کہ کتنے ہی قلم ان سرداروں کی چوکھٹ پر ٹوٹ گئے۔"

ابھی باتیں نہیں شاہ میر، پہلے تمہارا زخم صاف کرنا ہوگا،" میں نے اپنی قمیض کا ایک حصہ پھاڑتے ہوئے کہا۔اس کی بات میں سچائی کی وہ کڑواہٹ تھی جو صرف بھوگنے والا ہی جانتا ہے۔ میں نے اس کی پٹی باندھتے ہوئے پوچھا، "یہ زخم کسی دشمن کی گولی کا ہے یا کسی اپنوں کی سازش کا؟" شاہ میر نے ایک لمبا سانس لیا، اس کی آنکھوں میں ایک دم غصے کی چمک لہرائی۔ "ذیشان صاحب! دشمن تو باہر بیٹھا ہے، لیکن اسے راستہ وہ 'سردار' دکھاتے ہیں جنہیں آپ لوگ شہروں میں ایوارڈ دیتے ہیں۔ یہ گولی سردار زارک خان بلوچ کے کارندوں نے چلائی ہے۔"

میں رک گیا۔ سردار زارک خان بلوچ وہی نام جو ایڈیٹر نے فائل میں دیا تھا۔ "پولیس کہاں ہے؟" میں نے ارد گرد دیکھتے ہوئے پوچھا۔

شاہ میر نے حقارت سے تھوکا۔ "پولیس؟ وہ تو سردار زارک خان کی جیب میں رہتی ہے۔

پولیس اس سرحد پر صرف غریب کا راستہ روکنے کے لیے کھڑی ہوتی ہے۔ سردار کی گاڑی کے لیے تو وہ خود راستہ بناتے ہیں۔ یہاں قانون وہی ہے جو سردار لکھتے ہیں۔" اس کی باتیں کسی ہتھوڑے کی طرح میرے ذہن پر لگ رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ مقدمہ جتنا میں نے سوچا تھا، اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور گہرا ہے۔

میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ تو پھر ٹھیک ہے شاہ میر، آج سے تمہارا زخم میرا دکھ ہے اور تمہارا مقدمہ میرا قلم لڑے گا۔" میں نے شاہ میر کا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھا اور اسے سہارا دے کر سڑک سے نیچے بنی ہوئی ایک پگڈنڈی کی طرف بڑھنے لگا۔ دھماکے اور فائرنگ کے بعد اب ہر طرف ایک خوفناک سناٹا چھایا ہوا تھا، جیسے یہ پہاڑ بھی کسی بڑی سازش کے گواہ ہوں۔

ہمیں یہاں سے جلد نکلنا ہوگا ذیشان بھائی،" شاہ میر نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "سردار کے کارندے اب تک پولیس کو 'سیٹ' کر چکے ہوں گے، وہ دوبارہ ہمیں ڈھونڈنے ضرور آئیں گے۔" فکر نہ کرو، ہمیں کوئی محفوظ جگہ ڈھونڈنی ہوگی،" میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔ دور ایک پہاڑی کے دامن میں مٹی کے کچھ بنے ہوئے کچے مکان نظر آرہے تھے، جن سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ "وہاں سامنے آبادی ہے، شاید وہاں کوئی ٹھکانہ مل جائے۔" شاہ میر نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ "وہ شاہ میر کا گاؤں ہے، لیکن اب وہاں قدم

رکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ سردار زارک خان نے میرے گھر والوں کو پہلے ہی وہاں سے بے دخل کر دیا ہے۔ اب وہ پورا گاؤں ایک قید خانہ بن چکا ہے۔"
میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ "اپنے ہی لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک؟ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟"
میر شاہ کے قدم لڑکھڑائے، مگر اس نے خود کو سنبھالا۔ "وہ ان پہاڑوں کے سینے میں چھپا ہوا کوئلہ اور سونا نکالنا چاہتا ہے، لیکن بیرونی کمپنیوں کے ساتھ جو معاہدہ اس نے کیا ہے، اس میں یہاں کے غریب بلوچ کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ میں نے جب ان کے 'ڈیتھ اسکواڈ' کے خلاف آواز اٹھائی، تو انہوں نے مجھے غدار قرار دے دیا۔"ہم چلتے چلتے ایک پرانی اور بوسیدہ غار کے قریب پہنچ گئے جو شاید چرواہوں نے بنائی تھی۔ میں نے شاہ میر کو وہاں بٹھایا اور خود باہر نکل کر حالات کا جائزہ لینے لگا۔
"شاہ میر،" میں نے مڑ کر اسے دیکھا، "تم نے کہا تھا کہ 'تم لوگ' شہروں میں ان سرداروں کو ایوارڈ دیتے ہو۔ کیا تمہیں لگتا ہے کہ ہر پنجابی یا ہر شہر میں رہنے والا تمہارے دکھ سے غافل ہے؟"شاہ میر نے اپنی بھاری آنکھیں جھکائیں اور دھیمی آواز میں بولا، "ہمیں یہی دکھایا گیا ہے ذیشان صاحب۔ ہمیں بتایا گیا کہ پنجاب ہمارے وسائل لوٹ رہا ہے، لیکن جب میں نے قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ لوٹنے والا تو وہ سردار بھی ہے جو ہمارے درمیان بیٹھ کر بیرونی طاقتوں کا ایجنڈا چلا رہا ہے۔ وہ ہمیں لسانیت کے نام پر لڑواتا ہے تاکہ ہم کبھی ان سے اپنے حق کا سوال نہ کر سکیں۔"اس کی باتیں میرے لیے ایک نئی حقیقت کا در وا کر رہی تھیں۔ میں نے اپنا لیپ ٹاپ بیگ سے نکالا اور اس کی سکرین کی روشنی میں شاہ میر کے چہرے کو دیکھا۔ وہ چہرہ جو اب صرف ایک بلوچ کا نہیں، بلکہ اس 'مقدمے' کا پہلا صفحہ بن چکا تھا۔
"آج کی رات ہمیں یہاں گزارنی ہوگی،" میں نے پختہ ارادے سے کہا۔ "کل صبح میں تمہاری کہانی لکھوں گا، لیکن اس بار یہ صرف ایک خبر نہیں ہوگی۔ یہ 'بلوچستان کا مقدمہ' ہوگا، جو براہِ راست اس مافیا کے گریبان تک پہنچے گا۔"شاہ میر نے پہلی بار میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ "ذیشان بھائی، قلم کی سیاہی سستی ہے، لیکن یہاں سچ کی قیمت خون سے چکانی پڑتی ہے۔ کیا تم تیار ہو؟"میں نے مسکراتے ہوئے اپنے قلم کو چھوا۔ "شاہ میر، جس دن میں نے یہ قلم اٹھایا تھا، اسی دن اپنی زندگی اس مٹی کے نام کر دی تھی۔"
میرے ان الفاظ نے غار کی خاموشی میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا۔ شاہ میر نے خاموشی سے میری طرف دیکھا، شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ لاہور کی آسائشیں چھوڑ کر آنے والا یہ نوجوان سچ کی اتنی بڑی قیمت چکانے کے لیے ذہنی طور پر تیار بیٹھا ہے۔میں نے غار کی ٹھنڈی اور سنگلاخ دیوار سے ٹیک لگا لی۔ باہر گھپ اندھیرا تھا اور دور کہیں پہاڑی کوئلوں کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔میرے ذہن میں ایک پل کے لیے یہ خیال آیا کہ ایک صحافی کے طور پر میرے پاس وہ طاقت تھی کہ میں صرف ایک فون کال کرتا اور پولیس سے لے کر انتظامیہ تک میری

حفاظت کے لیے پہنچ جاتی۔ لاہور میں بیٹھے میرے بااثر دوست اور میرا ادارہ میری ایک پکار پر زمین آسمان ایک کر سکتے تھے۔ لیکن میں یہاں اس بوسیدہ غار میں ایک زخمی بلوچ کے ساتھ کیوں چھپا بیٹھا تھا؟

میں نے شاہ میر کی طرف دیکھا جو درد کی شدت سے آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ اگر میں ابھی کسی قریبی چوکی پر مدد کے لیے جاتا، تو پروٹوکول تو مل جاتا، لیکن کیا وہ سچ بھی ملتا جس کی تلاش میں میں یہاں آیا تھا؟ بلوچستان کے ان دور افتادہ علاقوں میں ریاست کی رٹ (Writ) سے زیادہ سردار زارک خان جیسے لوگوں کا خوف بستا تھا۔ سردار کے کارندے سرکاری وردیوں میں بھی ہو سکتے تھے اور عام شہریوں کے روپ میں بھی۔ اگر میں نے جلد بازی کی، تو شاہ میر کو "مقابلے" میں مار دیا جاتا اور میری موت کو ایک "حادثہ" بنا کر فائلیں ہمیشہ کے لیے بند کر دی جاتیں۔ میں صرف اپنی جان بچانے نہیں آیا تھا، میں تو اس سازش کی جڑ تک پہنچنے آیا تھا جسے سردار نے بڑی صفائی سے چھپا رکھا تھا۔

"ذیشان صاحب۔۔۔" شاہ میر کی دھیمی آواز نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ "آپ کا ایک فون آپ کو اس عذاب سے نکال سکتا ہے۔ آپ کیوں ایک اجنبی کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا رہے ہیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، جہاں حیرت اور شک ابھی بھی موجود تھا۔ "شاہ میر،" میں نے سنجیدگی سے کہا، "اگر میں سرکاری سیکیورٹی کے حصار میں کوئٹہ پہنچتا، تو مجھے وہی سچ دکھایا جاتا جو سردار زارک خان دکھانا چاہتا ہے۔ مجھے وی وی آئی پی (VVIP) گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا کر فائلوں کا پیٹ بھر دیا جاتا۔ لیکن میں یہاں 'سرکاری مہمان' بن کر نہیں، ایک 'حق پرست' بن کر آیا ہوں۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور پھر بات جاری رکھی، "ریاست میری سپورٹ میں ضرور ہے، لیکن یہاں کے میدانوں میں سردار کا 'ڈیتھ اسکواڈ' ریاست سے زیادہ تیز ہے۔ میں تمہیں ان کے حوالے نہیں کر سکتا۔ اگر میں نے تمہیں بچانے کے لیے چھپنے کا راستہ چنا ہے، تو اس کا مطلب بزدلی نہیں بلکہ یہ میری اس 'مقدمے' کی پہلی حکمت عملی ہے تاکہ دشمن کو لگے کہ وہ کامیاب ہو گیا ہے، جبکہ ہم اس کے خلاف ثبوت جمع کر رہے ہوں۔ جب میرا قلم بولے تو اس کے پاس چھپنے کی جگہ نہ رہے۔"" شاہ میر کے چہرے پر ایک اطمینان سا ابھرا۔ "آپ کے قلم کی طاقت کا تو پتا نہیں، لیکن آپ کے ارادے ان پہاڑوں سے زیادہ مضبوط لگ رہے ہیں۔" ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ اچانک غار کے باہر خشک جھاڑیوں پر کسی کے چلنے کی آہٹ ہوئی۔ کسی نے بہت احتیاط سے قدم رکھا تھا، لیکن ایک گہری خاموشی میں وہ آہٹ میرے کانوں سے نہ بچ سکی۔ میری صحافتی حس نے خطرے کی گھنٹی بجا دی۔

میں نے فوراً اپنا ہاتھ شاہ میر کے منہ پر رکھا اور اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اپنی ٹارچ بند کر دی اور غار کے دھانے کی طرف نظریں جما دیں۔ شاہ میر۔۔۔ او شاہ میر۔۔۔ مَنی چُک (میرے بچے) کہاں ہو تم؟" ایک لرزتی ہوئی بوڑھی آواز غار کے سناٹے میں گونجی۔

شاہ میر نے ایک گہرا سانس لیا اور ریلیف کے ساتھ میرا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا، "ذیشان صاحب، ٹارچ جلائیے، یہ میرے چاچا غوث بخش ہیں۔"

میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے ٹارچ جلائی۔ روشنی کی لکیر غار کے دہانے پر پڑی تو وہاں ایک ادھیڑ عمر کا شخص کھڑا تھا جس کے چہرے پر گہری جھریاں تھیں اور آنکھوں میں وہی درد تھا جو میں نے میر شاہ کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اس کے کندھے پر ایک پرانی رائفل لٹک رہی تھی، مگر اس کی نال زمین کی طرف تھی، جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ کسی جنگ کے لیے نہیں بلکہ اپنوں کی تلاش میں نکلا ہے۔

"چاچا غوث بخش؟" شاہ میر نے حیرت اور نقاہت سے پوچھا۔ "آپ یہاں اس وقت؟"

غوث بخش غار کے اندر داخل ہوا اور جیسے ہی روشنی شاہ میر کے خون میں تر زخمی کندھے پر پڑی، اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر تڑپتے ہوئے شاہ میر کا سر چوما اور روہانسی آواز میں بولا:

"اوئے نادان! میں نے تجھے روکا تھا کہ ان سرداروں سے مت الجھ، یہ زہریلے سانپ ہیں، ان کی ڈس کا کوئی علاج نہیں۔" اس کے لہجے میں ممتا جیسی تڑپ اور بے بسی تھی۔ "سردار کے کارندے پورے لک پاس پر پھیلے ہوئے ہیں، وہ پاگل کتوں کی طرح تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ انہوں نے تمہارے گھر کو آگ لگا دی ہے شاہ میر، تمہارا سب کچھ راکھ کر دیا گیا۔"

میرے سینے میں ایک دم غصے کی لہر دوڑی۔ "ایک بے گناہ کے گھر کو آگ؟ کیا اس ملک میں کوئی قانون نہیں؟" میں نے بے اختیار پوچھا، میرا لہجہ جذبات کی شدت سے بلند ہو گیا تھا۔ غوث بخش چونک کر پیچھے ہٹا، روشنی کی چمک میں اب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ تھوڑا ہچکچایا۔ اس کی آنکھوں میں اجنبی کے لیے وہی شک ابھرا جو بلوچستان کی سرحدوں پر اکثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس نے شاہ میر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، "یہ کون ہے شاہ میر؟"

شاہ میر نے تکیہ لگائے ہوئے جواب دیا، "چاچا، یہ ذیشان ایک مسافر ہے۔ جب سردار کے لوگوں نے لک پاس پر حملہ کیا تو سب اپنی جانیں بچا رہے تھے، مگر اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر میری جان بچائی اور مجھے سہارا دے کر یہاں تک لے کر آیا۔"

غوث بخش نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ "مسافر؟ اس آگ کے وقت یہاں کون مسافر آتا ہے؟" ان کے لہجے میں شک اور فکر دونوں جھلک رہے تھے۔ "بیٹا، تم جو کوئی بھی ہو، یہاں سے نکل جاؤ۔ یہ لڑائی تمہاری نہیں ہے۔" میں نے نہایت سنجیدگی اور تحمل سے جواب دیا، "چاچا، میں اتفاقاً یہاں پہنچا ضرور ہوں، لیکن اب جو میں نے دیکھ لیا ہے، اس کے بعد میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میں ایک لکھاری ہوں، میں سچ لکھتا ہوں۔" غوث بخش نے ایک سرد آہ بھری۔ "لکھاری؟ بیٹا، یہاں سچ کی قیمت بہت بھاری ہے۔" انہوں نے شاہ میر کی طرف مڑ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی، "بیٹا، سردار زارک خان کے لوگ پورے علاقے میں تم کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں

کہ تم نے ان کے 'ترقیاتی کاموں' میں رکاوٹ ڈالی ہے۔ میری مانو تو ابھی خاموش ہو جاؤ، یہ طوفان گزر جانے دو۔"
شاہ میر کی آنکھوں میں ایک دم غصے کی چمک لہرائی۔ "کیسی خاموشی چاچا؟ ہماری زمینیں بیرونی کمپنیوں کو بیچی جا رہی ہیں اور بدلے میں ہمیں صرف گولی اور بھوک مل رہی ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو گمراہ کر کے ریاست کے سامنے کھڑا کیا جا رہا ہے، اور ان سب کے پیچھے یہ وڈیرے اور سردار ہیں جو اسلام آباد میں بیٹھ کر ہمارا سودا کرتے ہیں۔ اب میں خاموش نہیں رہوں گا، اور اب تو ذیشان کا قلم بھی میرے ساتھ ہے۔"
چاچا غوث بخش ایک پل کے لیے خاموش ہو گئے، شاید میر شاہ کے لہجے کی کاٹ نے انہیں لاجواب کر دیا تھا۔ پھر وہ میری طرف مڑے، ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ انہوں نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ان کے کھردرے ہاتھوں میں وہ روایتی بلوچی شکریہ تھا جو لفظوں کا محتاج نہیں ہوتا۔بیٹا! اللہ تمہیں جزا دے۔ اس مٹی پر اپنوں نے تو بہت زخم لگائے ہیں، لیکن آج تم نے ایک مسافر ہو کر جس طرح میرے یتیم بھتیجے کا ساتھ دیا ہے، اس نے میری بوڑھی آنکھوں کو حیا دار کر دیا ہے۔ بلوچ کبھی اپنے محسن کا احسان نہیں بھولتا۔ تم نے صرف شاہ میر کو سہارا نہیں دیا، تم نے اس بوڑھے چاچا کی لاٹھی ٹوٹنے سے بچا لی ہے۔ کاش تمہارے جیسے چند اور قلمکار بھی اس سچ کو دیکھ پاتے جو تم نے دیکھ لیا ہے۔"
ان کی دعا کے الفاظ میرے دل میں اترتے چلے گئے اور مجھے محسوس ہوا کہ اب میرا اور شاہ میر کا رشتہ صرف ایک اتفاقی ملاقات نہیں، بلکہ ایک مقدس عہد بن چکا ہے۔میں نے شاہ میر کے گھر کے جلنے کی خبر پر گرفت کرتے ہوئے کہا، "چاچا، گھر اینٹ پتھر کا ہوتا ہے، وہ دوبارہ بن جائے گا، لیکن یہ جو آگ سردار زارک خان نے لگائی ہے، اسے اب بجھانا ہو گا۔
چاچا غوث بخش نے ایک سرد آہ بھری اور کھڑے ہو گئے۔ "میں تمہارا جذبہ سمجھتا ہوں بیٹا، لیکن میں بوڑھا آدمی ہوں، صرف تمہاری خیریت کی دعا کر سکتا ہوں۔ میں ابھی جا رہا ہوں تاکہ کسی کو شک نہ ہو، میں صبح پھر آنے کی کوشش کروں گا۔ اللہ تم دونوں کا حامی و ناصر ہو۔" وہ ہمیں دعائیں دیتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ غار میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی، لیکن اس بار یہ خاموشی ڈر کی نہیں بلکہ ایک عزم کی تھی۔شاہ میر کی آنکھیں چھت کی طرف جمی تھیں، شاید وہ اپنے جلتے ہوئے گھر کے دھوئیں کو اپنی بند آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔
"ذیشان صاحب۔۔۔" اس کی آواز غار کی دیواروں سے ٹکرا کر گونجی۔ "آپ نے چاچا سے کہا کہ آپ سچ لکھتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس ملک کے بڑے شہروں میں بیٹھنے والے لوگوں کے لیے 'سچ' کی تعریف کیا ہے؟"میں نے اپنا بیگ قریب کیا اور سنجیدگی سے جواب دیا، "میر شاہ، شہروں میں سچ اکثر مفادات کی نذر ہو جاتا ہے، لیکن ایک لکھاری جب مٹی کے قریب آتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اصل سچ تو ان سسکیوں میں ہے جو اقتدار کے شور میں دب جاتی ہیں۔"

شاہ میر نے ایک کڑوی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ "آپ نے دیکھا چاچا کا حال؟ وہ ڈر رہے ہیں۔ یہ ڈر انہیں کسی دشمن نے نہیں، بلکہ ان 'سرداروں' نے دیا ہے جو خود کو زمین کا خدا سمجھتے ہیں۔ سردار زارک خان جیسے لوگ ہمیں ریاست سے لڑواتے ہیں تاکہ ہم ان سے یہ نہ پوچھ سکیں کہ ہمارے اسکولوں کا پیسہ کہاں گیا، ہماری ہسپتالوں کی زمین پر کس کا قبضہ ہے۔" میں نے اس کے زخم کی پٹی کو تھوڑا درست کیا اور کہا، "شاہ میر، میرا مقدمہ یہی تو ہے۔ یہ جو لسانیت کی دیوار کھڑی کی گئی ہے کہ پنجابی تمہارا دشمن ہے، یا بلوچ ریاست کے خلاف ہے—یہ سب اس مافیا کا پروپیگنڈا ہے تاکہ وہ اپنا راج قائم رکھ سکیں۔" شاہ میر نے تڑپ کر کہا، "بالکل! وہ ہمارے نوجوانوں کو بندوق تھما کر پہاڑوں پر بھیج دیتے ہیں اور خود اسلام آباد کے محفوظ بنگلوں میں بیٹھ کر بیرونی طاقتوں سے سودا کرتے ہیں۔ ذیشان صاحب، یہ جنگ اب صرف زمین کی نہیں، یہ بقا کی جنگ ہے۔ اگر آج ہم نے اس 'نیٹ ورک' کو بے نقاب نہ کیا تو یہ مٹی بانٹ دی جائے گی۔"

میں نے اپنا لیپ ٹاپ دوبارہ آن کیا، اس کی سکرین کی ہلکی روشنی نے غار کے اندھیرے کو تھوڑا سا کم کر دیا۔ میں نے ٹائپ کرنا شروع کیا: 'بلوچستان کا مقدمہ - پہلی فریاد'۔ "شاہ میر،" میں نے سکرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "کل صبح جب ہم یہاں سے نکلیں گے، تو ہم صرف دو مفرور نہیں ہوں گے۔ ہم وہ آواز ہوں گے جو ان سنگلاخ پہاڑوں سے نکل کر تختِ لاہور اور ایوانِ اسلام آباد تک پہنچے گی۔ ہم دکھائیں گے کہ ایک پنجابی کا قلم اور ایک بلوچ کا لہو جب ایک ہو جاتا ہے، تو ظلم کے بڑے سے بڑے بت پاش پاش ہو جاتے ہیں۔" سردار زارک خان جیسے جھوٹوں کے محل زمین بوس ہو جاتے ہیں"

شاہ میر کی آنکھوں میں امید کی ایک چمک لہرائی۔ "تو پھر ٹھیک ہے ذیشان صاحب، آج کی رات گواہ رہے کہ اس غار میں ایک نیا رشتہ پیدا ہوا ہے—انسانیت کا رشتہ۔" رات بھیگتی رہی، باہر لک پاس کے پہاڑ خاموش گواہ بنے کھڑے تھے اور غار کے اندر ایک نیا انقلاب جنم لے رہا تھا

غار کی خاموشی میں ہم نے رات کا پچھلا پہر تھوڑی دیر آنکھ لگا کر گزارا۔ لک پاس کی ٹھنڈی ہواؤں کے بیچ پتھریلی زمین پر وہ چند گھنٹوں کا آرام میری زندگی کی سب سے عجیب نیند تھی۔ جب میری آنکھ کھلی تو پو پھٹنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ شاہ میر اپنی چادر درست کر رہا تھا، اس کے چہرے پر تھکن تو تھی لیکن ارادے اب بھی ان پہاڑوں کی طرح مضبوط تھے۔

"ذیشان بھائی، اٹھ جائیں۔ سورج نکلنے سے پہلے ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا،" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ میں نے ہڑبڑا کر اپنا بیگ سنبھالا۔ "ہاں شاہ میر، میں تیار ہوں۔ اب ہمیں کس طرف رخ کرنا ہے؟"

شاہ میر نے غار سے باہر جھانک کر آسمان کی سرخی کو دیکھا اور کہا ہم مستونگ کی طرف جائیں گے وہاں میرا ایک بچپن کا دوست ہے، ہم کچھ وقت وہاں گزاریں گے اور وہاں سے ہمیں آگے کے حالات کا بہتر اندازہ ہو سکے گا۔ ہم

غار سے باہر نکلے تو وادی میں ہلکی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ہم نے خاموشی سے پہاڑ کی ڈھلوان اترنا شروع کی۔ سڑک پر دور کہیں پولیس کی اکا دکا گاڑیاں نظر آ رہی تھیں جو اپنی معمول کی گشت پر تھیں، جیسا کہ بلوچستان کی شاہراہوں پر ہوتا ہے۔ ذیشان بھائی، یہ جو آپ کو پولیس کی روشنیاں نظر آ رہی ہیں، یہ یہاں امن و امان کے لیے تو ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ ان میں سے کئی وردیاں سردار زارک خان کے دستر خوان کی مرہونِ منت ہیں، شاہ میر نے تلخی سے کہا۔ ہمیں گلہ اس نظام سے ہے جو سردار زارک خان جیسے مہروں کو تو سینے سے لگاتا ہے، لیکن ہم جیسے اصلی وارثوں کو غدار قرار دے دیتا ہے۔ یہ پولیس اور یہ ناکے اسی نظام کی زنجیریں ہیں جو صرف کمزور کو جکڑنا جانتی ہیں۔ میں نے شاہ میر کی بات خاموشی سے سنی۔ یہ وہی تضاد تھا جسے میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کرنا تھا۔ قانون تو موجود تھا، لیکن وہ طاقتور کے سامنے بے بس نظر آ رہا تھا۔ پو پھٹنے کے ساتھ ہی چرواہے اپنے ریوڑ نکال رہے تھے۔ ان مظلوم لوگوں کی آنکھوں میں ایک ایسا خوف تھا جو بتاتا تھا کہ یہاں کی خاموشی میں کتنے ہی طوفان چھپے ہیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم ایک چھوٹی سی سڑک تک پہنچ گئے جہاں چند پرانی گاڑیاں اور مقامی مسافر کھڑے تھے۔

شاہ میر نے ایک پرانی پک اَپ گاڑی والے سے بات کی۔ کچھ دیر بحث کے بعد وہ ہمیں مستونگ کی طرف لے جانے پر راضی ہو گیا — لیکن شرط یہ تھی کہ راستے میں ہم اس کے کام میں مداخلت نہیں کریں گے اور سفر کو جتنا ممکن ہو غیر محسوس رکھیں گے۔

گاڑی چل پڑی۔ یہ سفر اب مختلف تھا۔ کھڑکی سے باہر پہاڑ اب بھی ساتھ ساتھ چل رہے تھے، مگر رفتار بدل چکی تھی۔ کہیں کہیں چیک پوسٹیں نظر آتی تھیں جہاں گاڑی کو روک کر مختصر پوچھ گچھ ہوتی، اور پھر ہم دوبارہ آگے بڑھ جاتے۔ شاہ میر خاموش تھا۔ اس کی آنکھیں ہر موڑ پر جیسے کسی خطرے کو پہچان رہی تھیں۔ راستے میں ایک جگہ گاڑی کو کافی دیر روکنا پڑا۔ وہاں ایک چھوٹی سی چیک پوسٹ تھی۔ جہاں دو سکیورٹی اہلکار کھڑے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی آہستہ کی اور کھڑکی نیچے کر دی۔ "کہاں جا رہے ہو؟" ایک اہلکار نے سخت لہجے میں پوچھا۔

ڈرائیور نے مختصر سا جواب دیا، "مستونگ۔ مسافر ہیں۔" اہلکار کی نظر گاڑی کے اندر گھومی۔ پہلے ڈرائیور، پھر مجھ پر، اور آخر میں شاہ میر پر۔ ایک لمحہ وہ خاموش رہا، جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آ رہے ہیں۔ "شناختی کارڈ دکھاؤ۔"

ہم نے خاموشی سے کارڈز نکال کر دے دیے۔ اس نے ایک نظر ڈالی، پھر واپس کر دیے۔ اس کی نظریں ایک بار پھر شاہ میر کے چہرے پر ٹھہریں، مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ "ٹھیک ہے، جاؤ۔ لیکن سیدھے راستے پر رہنا۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ہم دوبارہ روانہ ہو گئے گاڑی مستونگ کی طرف مسلسل چل رہی تھی۔ راستے میں خاموشی گہری ہوتی جا رہی تھی اور شاہ میر کی نظریں ہر موڑ پر کسی انجان خطرے کو محسوس کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے ڈرائیور کو ہلکے سے اشارہ کیا۔ "یہیں آگے ایک موڑ پر رک جانا،"

ڈرائیور نے سر ہلایا اور گاڑی سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ روک دی۔ گرد کے بادل جیسے ہی بیٹھے، ہم دونوں نیچے اتر آئے۔ "آگے گاڑی نہیں جائے گی؟" میں نے پوچھا۔ شاہ میر نے مختصر سا جواب دیا، "نہیں... یہاں سے ہمیں پیدل جانا ہو گا۔"

ڈرائیور نے ایک نظر ہم پر ڈالی، کچھ نہ بولا، بس گاڑی موڑ کر واپس مرکزی سڑک کی طرف چل پڑا۔ اس کے جانے کے بعد وہاں ایک عجیب سی خاموشی رہ گئی۔ ہم نے پگڈنڈی کا رخ کیا اور آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا۔ جب ہم مستونگ کی مضافاتی آبادی کے قریب پہنچے، تو شاہ میر ایک چھوٹے سے سیبوں کے باغ کے پاس رک گیا۔ اس نے سامنے بنے ایک کچے مگر پُر وقار مکان کی طرف اشارہ کیا جس کی دیواروں پر وقت کی دھول جمی تھی۔ "وہ سامنے جو گھر ہے، وہ مرزا بلوچ کا ہے،" شاہ میر نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "مرزا میرا وہ دوست ہے جس نے کبھی سردار کے سامنے جھکنا نہیں سیکھا۔ آج کا دن ہم وہاں گزاریں گے، اور وہیں سے ہمیں پتا چلے گا کہ مستونگ کی ان وادیوں میں سردار نے 'ترقی' کے نام پر عام بلوچ کا کتنا استحصال کیا ہے۔"

میں نے اپنے بیگ کو کندھے پر مضبوط کیا اور ایک عزم کے ساتھ اس کچے مکان کی طرف قدم بڑھا دیے۔ مستونگ کی یہ مٹی اب میرے قلم کے لیے ایک نئی گواہی بننے والی تھی۔ مکان کے لکڑی کے بوسیدہ دروازے پر شاہ میر نے ایک مخصوص دستک دی۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد دروازہ کھلا اور ایک چہرے پر نظر پڑی جس پر سختی اور مروت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ یہ مرزا بلوچ تھا—ایک دبلا پتلا مگر توانا جسم، جس کی آنکھوں میں ان پہاڑوں جیسی چمک تھی۔ "شاہ میر؟" مرزا کے لہجے میں حیرت اور تشویش کی لہر دوڑی۔ "اس وقت؟ اور یہ مسافر؟" اس نے شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"مرزا بھائی، یہ ذیشان بھائی ہیں یہ لاہور سے آئے ہیں

شاہ میر نے نحیف آواز میں میرا تعارف کرایا۔ "کل رات لک پاس پر مجھ پر حملہ ہوا تو اسی نے میری مدد کی

مرزا بلوچ نے میری طرف دیکھا، پھر اس کی نظر شاہ میر کے خون آلود کندھے پر پڑی تو اس کے ماتھے پر فکر کی لکیریں گہری ہو گئیں۔ اسنے آگے بڑھ کر شاہ میر کو سہارا دیا اور ہمدردی سے پوچھا، " شاہ میر! یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ زخم گہرا تو نہیں؟"

ہم اندر کچے کمرے میں داخل ہوئے جہاں مٹی کی دیواریں تپتی دھوپ کے باوجود ٹھنڈک کا احساس دے رہی تھیں۔ مرزا نے شاہ میر کو چارپائی پر بٹھایا۔ شاہ میر نے ایک لمبا سانس لیا اور زخم کو سہلاتے ہوئے بولا: "نہیں مرزا بھائی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ گولی بس چھو کر گزری ہے۔ اصل میں یہ گولی مجھے مارنے کے لیے نہیں، بلکہ مجھے ڈرانے کے لیے تھی کہ میں باز آ جاؤں۔ سردار زارک خان کے کارندے بس ایک دھمکاوا دینا چاہتے تھے کہ اگر اب میں نے ان کی زمینوں کے سودے کے خلاف آواز اٹھائی، تو اگلی گولی دل کے پار ہو گی۔"

مرزا خاموشی سے شاہ میر کی بات سنتا رہا، پھر اس نے صراحی سے پانی کا ایک کٹورا بھرا اور پہلے شاہ میر کو دیا، پھر ایک دوسرا کٹورا بھر کر میری طرف بڑھایا۔ "پی لیجیے ذیشان صاحب، مسافر کی تھکن پانی سے ہی اترتی ہے،" مرزا نے دھیمے مگر رعب دار لہجے میں کہا۔ پھر وہ تھوڑا رکا اور اس کی نظریں میری آنکھوں میں گڑ گئیں۔۔ آپ نے شاہ میر کی جان بچا کر اسے تو احسان مند کر لیا، لیکن ایک بلوچ کا اعتماد جیتنا اتنا آسان نہیں ہے۔"

صحن میں کچھ دیر کے لیے ایک بوجھل خاموشی چھا گئی۔ شاہ میر نے اپنا زخمی کندھا سہلایا اور مرزا کی طرف دیکھ کر بولا: "مرزا بھائی، یہ وہ صحافی نہیں ہیں جو ہوٹلوں میں بیٹھ کر خبریں لکھتے ہیں۔ یہ سڑک پر میرے ساتھ گرے تھے اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے یہاں تک لائے ہیں۔" مرزا نے میری طرف رخ کیا، اس کی آنکھوں میں اب بھی ایک پرکھ تھی۔ "ذیشان صاحب، ناراض نہ ہونا، لیکن ہماری مٹی پر جب بھی کوئی 'شہری' آتا ہے تو وہ یا تو سردار زارک خان کا مہمان ہوتا ہے یا پھر ہمارے وسائل کا سودا کرنے آیا ہوتا ہے۔ آپ کیا لینے آئے ہیں؟"

میں نے سنجیدگی سے جواب دیا، "مرزا بھائی، میں لاہور کی آسائشیں چھوڑ کر یہاں کچھ لینے نہیں، بلکہ وہ 'سچ' دینے آیا ہوں جس کی بلوچستان کو ضرورت ہے۔ میں اس 'مقدمے' کی فائل کھولنے آیا ہوں جو برسوں سے بند پڑی ہے۔" مرزا نے مجھے غور سے دیکھا، جیسے وہ میری نیت کو تول رہا ہو۔ پھر وہ بغیر کچھ کہے اندر کچن کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک لکڑی کے تھال میں گرم تندوری روٹیاں، مکھن کا پیڑا اور گڑ کی ڈلی لے کر آیا۔

"پہلے کھانا کھا لیں، خالی پیٹ باتیں کڑوی لگتی ہیں،" اس نے روٹی توڑ کر ہمارے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ بھوک اور تھکن کے بعد وہ سادہ سا کھانا کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ جب کھانا ختم ہوا اور ہاتھ دھو کر ہم دوبارہ بیٹھے، تو مرزا کا انداز بدل چکا تھا۔ اس کے لہجے میں اب نرمی بھی تھی اور آنکھوں میں ایک ایسی سنجیدگی بھی جو صرف ان لوگوں میں آتی ہے جنہوں نے وقت کو قریب سے دیکھا ہو۔ اس نے خالی برتن ایک طرف رکھے، صحن کی طرف چند لمحے خاموش کھڑا رہا، پھر واپس آ کر ہمارے سامنے بیٹھ گیا۔ مرزا نے پہلے شاہ میر کے زخمی کندھے کی پٹی دیکھی، پھر میری طرف غور سے دیکھا اور گہرا سانس لے کر بولا، ''ذیشان صاحب، جب کچھ دیر پہلے شاہ میر آپ کو اپنے ساتھ یہاں لایا تھا تو میں نے آپ کو صرف ایک اجنبی سمجھا تھا۔ میرے لیے آپ بھی انہی شہروں سے آئے ہوئے لوگوں جیسے تھے جو یہاں آتے تو ہیں، مگر ہمارا درد سمجھے بغیر واپس چلے جاتے ہیں۔ لیکن اپ کے چہرے پر موجود سکون سے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ صرف شاہ میر کے ساتھ نہیں آئے، آپ شاید اس مٹی کی آواز سننے آئے ہیں، تماشا دیکھنے نہیں۔''

میں نے سنجیدگی سے جواب دیا، ''مرزا بھائی، اب جب اتنا کچھ دیکھ لیا ہے تو واپس جانا آسان نہیں۔ مجھے یہ جاننا ہے کہ یہاں کے لوگوں کے دلوں میں اتنا غصہ کیوں ہے، شدت پسند تنظیمیں کیوں بنتی ہیں، نوجوان پہاڑوں کا رخ کیوں کرتے ہیں، ہر طرف بندوق ہی کیوں بولتی ہے۔''

اور اس آگ کو ہوا کون دے رہا ہے۔'' مرزا نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا اور بولا، ''یہی سوال اگر برسوں پہلے کسی نے پوچھ لیا ہوتا تو آج پہاڑوں میں بارود نہ اگتا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہاں شدت پسندی اچانک پیدا ہوئی، جیسے کسی دن آسمان سے اتر آئی ہو، مگر نہیں... یہ بھوک، محرومی، بے عزتی اور ناانصافی کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔ جب ایک نوجوان دیکھتا ہے کہ اس کے گاؤں میں پانی نہیں، اسکول نہیں، ہسپتال نہیں، نوکری نہیں، اور اوپر سے اسے شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، تو اس کے دل میں پہلے خاموش غصہ جنم لیتا ہے، پھر وہی غصہ اگر کسی سمجھدار ہاتھ میں نہ جائے تو بندوق پکڑ لیتا ہے۔''

شاہ میر نے بات آگے بڑھائی، ''لیکن ہر بندوق اٹھانے والا حق پرست نہیں ہوتا مرزا بھائی، کچھ لوگ ہمارے دکھ کو بھی کاروبار بنا لیتے ہیں۔'' مرزا نے فوراً اس کی تائید کی، ''بالکل۔ یہی اصل زہر ہے۔ ایک طرف سادہ نوجوان ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ آزادی یا عزت کے لیے نکلے ہیں، دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو ان کے جذبات کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کوئی انہیں نفرت سکھاتا ہے، کوئی بیرونی پیسہ دیتا ہے، کوئی سردار انہیں ڈھال بناتا ہے، اور کوئی شہر میں بیٹھ کر ان کے نام پر سیاست کرتا ہے۔ آخر میں مرتا ہمیشہ غریب کا بیٹا ہے۔'' اس کی آواز میں ایسا درد تھا جو صرف دیکھا نہیں، جھیلا ہوا لگتا تھا۔ میں نے اپنا قلم نکالا اور نوٹ کرتے ہوئے پوچھا، ''تو عام بلوچ کیا چاہتا ہے؟ کیا وہ جنگ چاہتا ہے؟'' مرزا نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں نے برسوں سے دبا ہوا سوال چھیڑ دیا ہو۔

وہ بولا، ''عام بلوچ جنگ نہیں چاہتا ذیشان صاحب، عام بلوچ عزت چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے غدار نہ کہا جائے، وہ چاہتا ہے کہ اس کی زمین سے نکلنے والی دولت میں اس کا حصہ ہو، اس کے بچے خوف کے بغیر اسکول جائیں، اس کی ماں کو ہر دوسرے دن لاپتا افراد کے کیمپ نہ جانا پڑے، اور اسے ہر وقت یہ ثابت نہ کرنا پڑے کہ وہ وفادار ہے۔ مگر جب انصاف بند ہو جائے تو غصہ راستہ ڈھونڈ لیتا ہے، اور یہی غصہ کبھی تنظیم بن جاتا ہے، کبھی نفرت، کبھی خاموشی، اور کبھی بغاوت۔'' وہ چاہتا ہے کہ اگر وہ پاکستانی ہے تو اسے محسوس بھی ہو کہ وہ پاکستانی ہے، صرف تقریروں میں نہیں، زندگی میں بھی۔''

میں نے پوچھا، ''اور سردار زارک خان بلوچ؟ اس کا اس سب سے کیا تعلق ہے؟'' مرزا کی آنکھوں میں ایک سخت چمک ابھری۔ وہ تھوڑا قریب ہو کر بولا، ''زارک خان صرف ایک آدمی نہیں، ایک نظام ہے۔ وہ شہر میں سوٹ پہن کر ترقی کی بات کرتا ہے، اسلام آباد میں وفاداری کے دعوے کرتا ہے، اور یہاں دیہات میں خوف بانٹتا ہے۔ اس کے لوگ کانوں کے ٹھیکے لیتے ہیں، زمینوں کے کاغذ بدلتے ہیں، نوجوانوں کو اپنے جھنڈے تلے لڑواتے ہیں، اور جب کوئی سوال کرے تو اسے یا تو غدار کہا جاتا ہے یا غائب کر دیا جاتا ہے۔'' اس کے الفاظ میں ایسا زہر تھا جو برسوں کے مشاہدے سے نکلا ہو۔

میں نے حیرت سے پوچھا، ''کیا لوگ اس کے خلاف نہیں بولتے؟'' مرزا ہنس پڑا، مگر وہ ہنسی دردناک تھی۔ ''بولتے ہیں ذیشان صاحب، مگر یہاں آواز اٹھانے والے دو طرح کے انجام دیکھتے ہیں۔ یا تو ان پر مقدمہ بن جاتا ہے، یا ان کے گھر والے تھانے اور کیمپوں کے چکر لگاتے رہ جاتے ہیں۔ کچھ کو سردار کے کارندے خاموش کر دیتے ہیں، کچھ کو حالات خاموش کر دیتے ہیں۔'' شاہ میر نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا، ''میرا قصور صرف یہ تھا کہ میں نے گاؤں والوں سے کہا تھا کہ اپنی زمین کا حساب مانگو۔ اگلے ہی دن میرے گھر پر حملہ ہوا، اور آج میں تمہارے سامنے زخمی بیٹھا ہوں۔''میں نے بات کو اگے بڑھاتے ہوئے کہا مرزا بھائی میں چاہتا ہوں کہ میں خود جا کر دیکھوں۔ کسانوں سے ملوں، مزدوروں سے بات کروں، ان ماؤں سے ملوں جن کے بیٹے لاپتا ہیں، ان نوجوانوں سے پوچھوں جو پہاڑوں کی طرف گئے یا جانا چاہتے ہیں، ان دکانداروں سے سنوں جو روز خوف میں کاروبار کرتے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ عام بلوچ کیا سوچتا ہے، کیا چاہتا ہے، اور اس کے دل میں اصل زخم کیا ہے۔ جب تک میں لوگوں کی آواز نہ سنوں، میری فائل ادھوری رہے گی۔''مرزا نے پہلی بار میرے چہرے کو اس نظر سے دیکھا جیسے کسی انسان کو پرکھنے کے بعد قبول کیا جاتا ہے۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور بولا، تو پھر تمہیں سڑکوں پر چلنا ہوگا، گرد کھانی ہوگی، لوگوں کے گھروں میں بیٹھنا ہوگا، ان کے ساتھ خشک روٹی توڑنی ہوگی۔ بلوچستان کو دفتر کی کرسی پر بیٹھ کر نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہاں کی سچائی جوتوں کی دھول سے نکلتی ہے، فائلوں سے نہیں

میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا، ''میں اسی لیے آیا ہوں مرزا صاحب۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس مٹی کے اندر آگ کیوں ہے اور امید ابھی باقی کیوں ہے۔''مرزا چارپائی سے اٹھا، کمرے کے کونے میں رکھے ایک پرانے صندوق کے پاس گیا اور کچھ دیر خاموشی سے اس میں چیزیں ڈھونڈتا رہا۔ پھر وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پاور بینک، پانی کی بوتل، کچھ نقد رقم اور ایک پرچی تھی جس پر دو تین نام اور نمبرز درج تھے۔ اس نے وہ سب ہمارے سامنے رکھتے ہوئے کہا، ''راستہ اب صرف پگڈنڈیوں سے نہیں ملتا، ذیشان صاحب، اب رابطے بھی راستے بناتے ہیں۔ مستونگ سے باہر جن دیہات کی طرف تم جا رہے ہو وہاں تمہیں کسان ملیں گے، کانوں میں کام کرنے والے مزدور ملیں گے، کچھ ایسے گھر بھی ملیں گے جہاں آج تک دروازہ اس امید پر کھلتا ہے کہ شاید لاپتا بیٹا واپس آ گیا ہو۔ یہ دو لوگ میرے بھروسے کے ہیں، ضرورت پڑے تو ان کا نام لینا، مگر یاد رکھنا، ہر سوال ہر جگہ نہیں پوچھنا۔ یہاں بعض سچ زبان پر آنے سے پہلے جان لے لیتے ہیں۔''میں نے وہ پرچی ہاتھ میں لی اور چند لمحے خاموشی سے اس پر لکھے ناموں کو دیکھتا رہا۔ سادہ سے الفاظ تھے، مگر ان کے پیچھے شاید کئی بند دروازوں کی چابیاں چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے احتیاط سے اپنی ڈائری کے اندر رکھا اور مرزا کی طرف دیکھ کر کہا، ''مرزا بھائی، آپ نے آج جو اعتماد دیا ہے، یہ میرے لیے کسی ہتھیار سے کم نہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں جو دیکھوں گا، سچ لکھوں گا، نہ کم نہ زیادہ۔'' مرزا کی آنکھوں میں ایک مدھم سی چمک ابھری۔ ''پھر سن لو ذیشان صاحب، اگر راستے میں کوئی مشکل آئے، اگر کوئی سایہ تمہارا پیچھا

کرے، اگر تمہیں لگے کہ زمین تنگ ہو رہی ہے، تو یہ دروازہ تمہارے لیے کھلا ہے۔ میں ساتھ نہیں چل سکتا، میرا یہاں رہنا ضروری ہے۔ کچھ لوگ سفر کرتے ہیں، کچھ لوگ مورچہ سنبھالتے ہیں۔
میں نے دھیمے سے لہجے میں کہا،اپ مورچہ سنبھالیں'' باقی میں سب دیکھوں گا مرزا بھائی۔ میں صرف خبر نہیں، حقیقت لے کر واپس آؤں گا۔''کچھ دیر ہم مزید اہم باتیں کرتے رہے پھر شاہ میر آہستہ سے اٹھا۔ اس نے زخم کے باوجود اپنی چادر درست کی اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا، ''ذیشان بھائی، اگر نکلنا ہے تو ابھی نکلتے ہیں۔ شام کے بعد راستے بھی بدل جاتے ہیں اور نیتیں بھی۔'' میں نے فوراً اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور کہا بلکل ہم ابھی نکلیں گے مرزا اٹھ کے شاہ میر کے پاس گیا دونوں ایک دوسرے کے گلے لگے کچھ دیر خاموش رہے۔ ان کے درمیان برسوں کی دوستی، دکھ اور خاموش وفاداری کھڑی تھی۔ مرزا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا، ''شاہ میر، غصہ تمہارے اندر بہت ہے، مگر اسے راستہ عقل دے جذبات میں نہیں، عقل سے لڑنا۔ تمہاری جان اب صرف تمہاری نہیں رہی، یہ اس سچ کی امانت ہے جو ابھی سامنے آنا باقی ہے۔'' پھر وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے احترام سے اس کا ہاتھ تھاما۔ اس کے ہاتھ کھردرے تھے، مگر گرفت مضبوط تھی۔ مرزا نے دھیرے سے کہا ذیشان بھائی ''اگر کبھی تمہیں لگے کہ سچ بہت مہنگا پڑ رہا ہے، تو یاد رکھنا... اس دھرتی نے جھوٹ کی قیمت اس سے زیادہ چکائی ہے۔
اس کی آواز میں ایسا درد تھا جو نصیحت سے زیادہ وصیت لگ رہا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے کہا، فکر نہ کریں اب میں اس مقدمے کو آخر تک لے کر جاؤں گا۔ مرزا نے دروازہ کھول دیا باہر گلی میں ہلکی گرد اڑ رہی تھی،دور پہاڑوں پر سورج کی روشنی پڑ رہی تھی اور فضا میں ایک عجیب سی سنجیدگی پھیلی ہوئی تھی۔
ہم دونوں باہر نکلے تو مرزا ابھی بھی دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی نظر ہمارے پیچھے تھی، جیسے وہ صرف دو لوگوں کو نہیں بلکہ کسی بڑے سفر کو رخصت کر رہا ہو۔

دوسرا باب۔۔۔۔۔۔۔بے آوازوں کی بستی

مرزا کے دروازے سے نکلتے وقت مجھے محسوس ہوا تھا جیسے میں ایک گھر نہیں، ایک گواہی پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ مستونگ کی کچی گلیوں میں چلتے ہوئے میرے قدم بھاری تھے، مگر ذہن پہلے سے زیادہ بیدار تھا۔ اب تک میں صرف چند لوگوں کی کہانیاں سن چکا تھا، مگر مجھے معلوم تھا کہ اصل بلوچستان ابھی سامنے آنا باقی ہے۔ وہ بلوچستان جو خبروں میں نہیں آتا، جو نقشوں پر تو موجود ہے مگر فیصلوں میں غائب رہتا ہے۔

شاہ میر میرے ساتھ خاموش چل رہا تھا۔ اس کی خاموشی میں بھی الفاظ تھے۔ کبھی وہ دور پہاڑوں کی طرف دیکھتا، کبھی آس پاس گزرنے والوں کے چہروں کو پڑھتا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا، ''اب کہاں جائیں گے؟''شاہ میر نے قدم تیز کیے اور کہا، ''پہلے ہم ایک ماں کے پاس جائیں گے... جس کا بیٹا تین سال سے لاپتا ہے۔ اگر آپ نے اس کی آنکھوں میں دیکھ لیا، تو آپ کو سمجھ

آجائے گی کہ یہاں کچھ نوجوان بندوق کیوں اٹھاتے ہیں''اب آپ کو اصل لوگوں سے ملواؤں گا ذیشان بھائی''آج سے آپ صرف سنیں گے نہیں... محسوس بھی کریں گے۔ کیونکہ یہاں ہر آدمی ایک کہانی نہیں، ایک زخم ہے۔ میں نے صحافت میں بہت خبریں پڑھی تھیں، لاپتا افراد کے اعداد و شمار بھی دیکھے تھے، مگر اعداد کبھی آنکھوں کے آنسو نہیں بتاتے۔ شاید آج پہلی بار میں کسی خبر کے پیچھے زندہ دکھ سے ملنے جا رہا تھا۔ میں نے نوٹ بک مضبوطی سے پکڑی اور آہستہ سے کہا، ''چلو شاہ میر... آج میں خبر نہیں، ماں کا درد سنوں گا۔''''ہمارے سامنے دھول اڑاتی سڑک پھیلی ہوئی تھی۔ دور کہیں عورتیں پانی کے برتن اٹھائے جا رہی تھیں، ایک بوڑھا شخص اپنے کمزور اونٹ کے ساتھ

چل رہا تھا، اور چند بچے ننگے پاؤں کھیلتے کھیلتے ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے دل میں سوچا، اگر یہ علاقہ واقعی صرف بارود اور بغاوت کی زمین ہے... تو پھر ان معصوم آنکھوں میں یہ خاموش سوال کیوں ہیں؟
میں نے پوچھا، ''یہ عورت کون ہے؟'' شاہ میر نے شائستگی سے جواب دیا، ''اس کا نام زر جان ہے۔ تین سال پہلے اس کا بیٹا داؤد بلوچ گھر سے نکلا تھا۔ کہہ کر گیا تھا کہ شام تک واپس آ جاؤں گا۔ پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ نہ لاش ملی، نہ خبر، نہ مقدمہ، نہ جواب۔ بس ایک انتظار رہ گیا۔''ہم ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے رکے۔ دروازہ لکڑی کا تھا، پرانا اور دھوپ سے پھٹا ہوا۔ چوکھٹ کے ساتھ ایک زنگ آلود تالا لٹک رہا تھا، مگر دروازہ کھلا تھا۔ صحن میں ایک سوکھی بیری کا درخت کھڑا تھا جس کی شاخیں ایسے جھکی ہوئی تھیں جیسے وہ بھی برسوں سے کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔
شاہ میر نے آہستہ سے آواز دی، ''خالہ زر جان... میں شاہ میر ہوں۔''

چند لمحوں بعد اندر سے دبے قدموں کی آہٹ آئی۔ ایک نحیف سی عورت دروازے پر نمودار ہوئی۔ چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا، مگر آنکھیں عجیب طرح زندہ تھیں... ایسی زندہ آنکھیں جنہوں نے شاید رونا چھوڑ دیا ہو۔ اس نے پہلے شاہ میر کو دیکھا، پھر مجھے۔ ''کون ہے یہ؟'' اس کی آواز میں تھکن تھی۔
شاہ میر نے احترام سے سر جھکایا۔ ''خالہ، یہ لاہور سے آئے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ آپ کی بات سننا چاہتے ہیں۔''زر جان خالہ نے چند لمحے خاموشی سے مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہ میں شک بھی تھا، تھکن بھی، اور وہ پرانا دکھ بھی جو انسان کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیتا ہے۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ اور کھول دیا اور دھیمی آواز میں بولی، ''بیٹا...
اندر آ جاؤ'' ''یہ گھر مہمانوں سے خالی نہیں، مگر خوشیوں سے خالی ہے۔''ہم دونوں خاموشی سے صحن میں داخل ہوئے۔ زمین کچی تھی، ایک کونے میں مٹی کا چولہا پڑا تھا جس پر راکھ جمی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک پرانی چارپائی رکھی تھی، جس کی بُنت کئی جگہ سے ڈھیلی ہو چکی تھی۔ صحن کے بیچ وہ سوکھی بیری کا درخت کھڑا تھا، جیسے برسوں سے اسی گھر کے دکھ کا پہرہ دے رہا ہو۔ زر جان نے اپنے دوپٹے کا پلو سر پر درست کیا اور کہا، ''بیٹھو بیٹا، گھر غریب کا ہے، دل تنگ نہیں۔''
میں اور شاہ میر چارپائی کے کنارے بیٹھ گئے۔ وہ خود زمین پر بچھے ایک پرانے دریچے پر بیٹھ گئی۔ میں نے نظریں اٹھائیں تو سامنے دیوار پر ایک نوجوان کی تصویر لگی تھی۔ تصویر میں ایک خوبرو سا لڑکا ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑا تھا، ہاتھ میں شاید کسی شادی یا عید کے دن پہنا ہوا نیا رومال تھا۔ تصویر کے شیشے پر گرد جمی تھی، مگر اس کے نیچے تازہ نہیں تو سوکھے ہوئے پھول رکھے تھے۔ میں سمجھ گیا... یہ داؤد بلوچ تھا۔
زر جان نے میری نظر تصویر پر پڑتی دیکھی تو آہستہ سے بولی، ''میرا داؤد... جب یہ تصویر بنی تھی نا بیٹا، اس دن بڑا ضد کر رہا تھا کہ ماں، میں بھی شہر والوں کی طرح تصویر بنواؤں گا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہی تصویر رہ جائے گی، اور میرا بچہ

کہیں راستوں میں کھو جائے گا۔"
اس کی آواز آخری لفظ پر ٹوٹ گئی۔ شاہ میر نے نظریں جھکا لیں۔ میں نے نوٹ بک نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا، مگر ہاتھ آدھے راستے میں ہی رک گیا۔ جیسے کسی نے اندر سے کہہ دیا ہو کہ ابھی نہیں۔
میں ایک لمحے کو ساکت ہو گیا۔ سامنے وہ ماں تھی جس کی آواز میں برسوں کا انتظار ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں اس لمحے لکھنے لگا تو شاید میں اس درد کو لفظوں میں بدل دوں گا، مگر اس کی اصل روح کہیں کھو جائے گی۔
میرا دل بھاری ہو گیا۔ میں نے نوٹ بک نکالنے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ قلم کی طرف ہاتھ بڑھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ مجھے شرمندگی سی محسوس ہوئی، جیسے میں کسی ایسے زخم کو کریدنے جا رہا ہوں جس پر ابھی نمک رکھا گیا ہو۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ صرف خبر نہیں، یہ ایک ماں کی سانسوں میں پھنسی ہوئی فریاد ہے۔ اسے لکھنے سے پہلے سننا ضروری ہے، محسوس کرنا ضروری ہے۔ ورنہ الفاظ صرف سیاہی رہ جائیں گے، سچ نہیں بنیں گے۔ میں نے آہستہ سے ہاتھ واپس کر لیا اور پہلی بار اپنے صحافی ہونے سے زیادہ ایک انسان ہونے کا وزن محسوس کیا۔
زر جان خالہ اٹھی، کچے گھڑے سے پانی نکالا اور پیتل کے دو گلاس ہمارے سامنے رکھ دیے۔ "پہلے پانی پیو بیٹا، سفر والے لگتے ہو۔" میں نے احترام سے گلاس تھاما اور کہا، "خالہ، ہم پانی بعد میں بھی پی لیں گے... پہلے آپ بیٹھیں۔ ہم آپ کا حال سننے آئے ہیں۔" وہ ہلکی سی مسکرائی، مگر وہ مسکراہٹ خوشی کی نہیں، عادت کی تھی۔ "حال؟ ہمارا حال وہی ہے بیٹا... صبح دروازہ دیکھتے ہیں، شام تصویر دیکھتے ہیں، رات اللہ سے رو رو کر دعائیں کرتے ہیں۔" یہ جملہ میرے دل میں تیر کی طرح لگا۔ میں تھوڑا سا آگے ہوا اور نرمی سے پوچھا، "خالہ... داؤد آخری بار کب گیا تھا؟ کیا کہہ کر نکلا تھا؟"
زر جان خالہ نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے اور خالی نظروں سے صحن کی مٹی دیکھنے لگی۔ "تین سال ہوئے۔ فجر کے بعد اٹھا۔ کہنے لگا، ماں بازار جا رہا ہوں، تمہارے لیے دوائی بھی لیتا آؤں گا۔ میں نے کہا جلدی آ جانا، روٹی ٹھنڈی ہو جائے گی۔ وہ ہنسا... کہنے لگا، ماں میں کوئی پردیس جا رہا ہوں کیا؟ شام تک آ جاؤں گا۔" وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ میں نے آہستہ سے پوچھا، "پھر؟" اس نے میری طرف دیکھا۔ آنکھیں خشک تھیں، مگر اندر طوفان تھا۔ "پھر شام آ گئی... رات آ گئی... اگلا دن آ گیا... تین سال آ گئے بیٹا... میرا داؤد نہیں آیا۔" صحن میں ایسی خاموشی اتری کہ دور سے کسی برتن کے گرنے کی آواز بھی صاف سنائی دی۔
میں نے احتیاط سے سوال کیا، "آپ نے تلاش کیا ہو گا؟" زر جان خالہ تلخ ہنسی ہنسی۔ "ایسا کون سا دروازہ ہے جہاں میں نہیں گئی؟ تھانہ، دفتر، کیمپ، عدالت، قبرستان... جہاں کسی نے کہا شاید وہاں ہو، میں گئی۔ کبھی کہتے یہاں نہیں، کبھی کہتے ہمیں کچھ معلوم نہیں، کبھی کہتے خاموش رہو۔ بیٹا، ماں کو خاموش رہنے کا کہنے والے نہیں جانتے، ماں کا دل

قبر سے بھی آواز سنتا ہے۔"
شاہ میر نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ "خالہ نے بہت دکھ اٹھایا ہے ذیشان بھائی... ایک بار تو دھکے دے کر نکال دیا تھا ان کو دفتر سے۔" میں نے غصہ دبایا اور نرمی سے پوچھا، "خالہ، داؤد کیا کرتا تھا؟ پڑھتا تھا؟ کام کرتا تھا؟" اس کے چہرے پر پہلی بار روشنی سی آئی۔ "بہت اچھا لڑکا تھا میرا۔ صبح مزدوری کرتا تھا، گھر کا خرچ چلانے کے لیے ہاتھ بٹاتا تھا اور شام کو جب تھوڑا وقت ملتا تو محلے کے بچوں کو بھی پڑھا دیتا تھا۔ وہ تھوڑا پڑھا لکھا تھا۔ کہتا تھا ماں، میں پیسے جمع کر کے تمہیں حج کرواؤں گا۔ گھر کی چھت ٹپکتی تھی، کہتا تھا سب ٹھیک کروں گا۔ وہ لمحہ بھر رکی دیوار پر لگی تصویر کو دیکھنے لگی۔
"اب چھت بھی ٹپکتی ہے... اور دل بھی۔"
میں خاموش رہا۔ نوٹ بک جیب میں ہی رہی۔ قلم ہاتھ میں نہیں آیا، مگر یہ الفاظ میرے اندر کہیں لکھے جا چکے تھے۔ یہاں گمشدگی صرف ایک انسان کی نہیں ہوتی... ایک گھر کا مستقبل بھی لاپتا ہو جاتا ہے۔ میں نے آہستہ سے پوچھا، "خالہ... داؤد کے جانے کے بعد کیا کبھی کسی نے آپ سے رابطہ کیا؟ کسی بھی طرف سے... چاہے سرکاری ادارے ہوں یا کوئی اور لوگ؟"
انہوں نے گہرا سانس لیا، پھر دھیمی آواز میں بولیں،
"بیٹا... رابطہ تو دور کی بات ہے، سوال کرنے والے بھی کم ہو گئے۔ جب انسان لاپتا ہو جائے نا... تو اس کے ساتھ اس کا نام بھی آہستہ آہستہ خاموش کر دیا جاتا ہے۔" میں نے اگلا سوال کیا،
"کیا کبھی آپ کو یا آپ کے گھر والوں کو کوئی دھمکی ملی کہ آپ اس معاملے کو زیادہ نہ اٹھائیں؟"
اس بار ان کی آنکھوں میں پہلی دفعہ ہلکی سی نمی آئی۔
"دھمکی لفظ بڑا نرم ہے بیٹا... یہاں تو بس اشارے ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی آ کر کہتا ہے خاموش رہو، کبھی کوئی سلام بھی ٹھیک سے نہیں کرتا... اور انسان سمجھ جاتا ہے کہ اب بولنا آسان نہیں رہا۔
"خالہ... میں ایک بات کھل کر پوچھنا چاہتا ہوں، برا نہ مانیں۔ کیا آپ کے دل میں کبھی یہ خیال آیا کہ داؤد کے ساتھ جو کچھ ہوا... اس میں کسی ریاستی ادارے کا کوئی کردار ہو سکتا ہے؟" میں نے فوراً لہجہ نرم رکھتے ہوئے اگلا سوال جوڑا، "یا پھر آپ کو لگتا ہے کہ یہ سب کسی ایسے گروہ کی طرف سے ہو سکتا ہے جو یہاں شدت یا خوف پیدا کرنا چاہتا ہے؟" میں تھوڑا جھکا اور سنجیدگی سے کہا،
"میں الزام نہیں لگا رہا خالہ... میں صرف یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ ایک ماں کے دل میں اصل احساس کیا ہے۔ آپ کے ذہن میں سب سے پہلا شک کس طرف جاتا ہے... یا آپ صرف سوال ہی سوال میں رہ گئی ہیں؟"
زر جان خالہ نے میرے سوال سن کر پہلے کچھ دیر کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ آنکھوں میں

نمی تھی، مگر آواز میں شکایت نہیں، بس تھکن تھی۔

"بیٹا..." وہ دھیرے سے بولی، "میں کسی کے نام لے کر گناہ اپنے سر نہیں لینا چاہتی۔ نہ میں نے کسی کو دیکھا ہے، نہ میرے پاس کوئی ثبوت ہے۔"

وہ لمحہ بھر رکی، پھر اپنی بات خود ہی سنبھالی۔

"مگر اتنا ضرور ہے... جب سے داؤد گیا ہے، میں نے ہر دروازے کو دیکھا ہے۔ کبھی تھانے کے چکر، کبھی دفاتر کے۔ کہیں سے بھی مجھے صرف خاموشی ملی ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ اب کھوئی ہوئی نہیں تھی، بلکہ جیسے اپنے اندر کے بوجھ کو لفظ دینے لگی تھی۔ "کبھی دل میں خیال آتا ہے کہ شاید وہ کسی ایسے ہاتھوں میں چلا گیا جو طاقتور ہیں... اور جو جواب دینا نہیں چاہتے۔ اور کبھی لگتا ہے کہ شاید وہ خود کسی ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے واپس آنا ممکن ہی نہیں رہا۔"

وہ ایک لمحے کو رکی، پھر آہستہ سے بولی،

"لیکن میں الزام نہیں لگاتی بیٹا... کیونکہ ماں کے پاس الزام نہیں ہوتا، صرف انتظار ہوتا ہے۔" پھر اس کی آواز تھوڑی اور بھاری ہو گئی:

"میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میرا بیٹا ایک دن گھر سے نکلا تھا... اور اس کے بعد پورا نظام میرے لیے سوال بن گیا ہے، جواب نہیں۔"

میں نے آہستہ سے کہا، "خالہ... اگر آپ کو ایک آخری بات کہنے کا موقع ملے، حکومت پاکستان سے یا ریاست سے... تو آپ کیا کہنا چاہیں گی؟

زر جان نے میری طرف دیکھا۔ اس بار وہ جلدی میں نہیں تھی۔ جیسے اس نے اس سوال کا جواب برسوں سے اپنے اندر محفوظ کر رکھا ہو۔ وہ دھیرے سے بولی، "میں بس یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ماں کو اس کے بیٹے کا حق واپس دے دو... اگر وہ زندہ ہے تو اسے لا کر میرے سامنے کھڑا کر دو، اور اگر نہیں ہے تو اس کی حقیقت بتا دو۔ ایک ماں کے لیے سب سے بڑا عذاب انتظار نہیں... بے خبری ہے۔"

اس نے سانس لیا، آنکھیں نم ہو گئیں۔ "اور اگر واقعی یہ ملک ہمارا ہے... تو پھر اس میں ہر ماں کو یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ اپنے بچے کے بارے میں سوال کر سکے، بغیر ڈر کے، بغیر خاموشی کے۔" پھر اس نے بہت آہستہ سے کہا، "میں کچھ زیادہ نہیں مانگتی بیٹا... بس میرا داؤد واپس نہیں آ سکتا تو کم از کم سچ واپس آ جائے۔" میں نے آہستہ سے اگلا سوال پوچھا، "خالہ... آپ کو کیا لگتا ہے، داؤد زندہ ہے؟" زر جان خالہ نے فوراً جواب دیا، بغیر ایک لمحہ سوچے۔ "ماں کے لیے بچہ کبھی نہیں مرتا بیٹا... جب تک خبر نہ آئے، امید زندہ رہتی ہے۔ اور کبھی کبھی امید ہی ماں کو زندہ رکھتی ہے۔"

زر جان خالہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہیں۔ صحن میں چلتی ہوا نے دروازے کی چرچراہٹ کو اور نمایاں کر دیا تھا۔ پھر

انہوں نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے دل میں برسوں سے بند ایک سوال اب ہونٹوں تک آ گیا ہو۔ وہ دھیرے لہجے میں بولیں، ''بیٹا... تم دور شہر سے آئے ہو، میری بات سن بھی لی، میرے آنسو بھی دیکھ لیے... مگر کیا اس سب کا کوئی فائدہ بھی ہو گا؟ کیا ایک غریب ماں کی فریاد واقعی اُن ایوانوں تک پہنچ سکتی ہے جہاں بڑے لوگ بیٹھتے ہیں؟ یا میری آواز بھی ان دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ جائے گی؟''

ان کے لفظوں میں شکوہ کم تھا، تھکن زیادہ تھی۔ میں نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے نہایت احترام سے کہا، ''خالہ، میں یہاں تماشا دیکھنے نہیں آیا۔ میں مظلوموں کی آہ سننے آیا ہوں، اور جو آہ سن لے وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ میں وعدہ تو نہیں کرتا کہ ایک دن میں سب بدل جائے گا، مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ آپ کی آواز کو دفن نہیں ہونے دوں گا۔ میں اسے لفظ دوں گا، صفحہ دوں گا، اور وہاں تک لے جاؤں گا جہاں سچ سننا ضروری ہے۔''

زر جان خالہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ انہوں نے کانپتے ہاتھ سے اپنے دوپٹے کا پلو آنکھوں پر رکھا اور بولیں، ''اللہ کرے تم سچے نکلو بیٹا...

اگر تم واقعی لکھتے ہو... تو میرا درد نہیں، میری دعا بھی ساتھ لے جاؤ۔''میں نے سر جھکا کر کہا، ''خالہ، دعا ہی اصل طاقت ہوتی ہے۔ قلم سیاہی سے نہیں، دعاؤں سے چلتا ہے۔'' یہ سن کر ان کے چہرے پر برسوں بعد شاید پہلی بار ہلکی سی روشنی آئی۔ انہوں نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور کہا، ''اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ تمہاری ماں کی جھولی خوشیوں سے بھری رہے۔ تم جہاں جاؤ حق کے ساتھ جاؤ، اور ظالم کے سامنے کبھی نہ جھکو۔ اگر تم نے ایک ماں کی آواز پہنچا دی، تو سمجھنا ہزار ماؤں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔''

میرے لیے وہ لمحہ کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔ میں نے احترام سے ان کے ہاتھ چومے۔ دیوار پر لگی داؤد بلوچ کی تصویر خاموشی سے ہمیں دیکھ رہی تھی، جیسے وہ بھی اس گفتگو کا گواہ ہو۔شاہ میر بھی خاموش کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی مگر چہرے پر سختی برقرار تھی۔ شاید وہ جانتا تھا کہ بلوچستان کی اصل طاقت بندوق نہیں، ایسی ماؤں کی دعائیں ہیں۔زر جان خالہ کو الوداع کرنے کے بعد ہم باہر نکلے تو شام ڈھلنے لگی تھی۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے اتر رہا تھا اور آسمان پر سرخی پھیل رہی تھی۔ گلی میں لمبے سائے بچھ گئے تھے۔ زر جان خالہ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی ہمیں جاتا دیکھتی رہیں۔ ایک ہاتھ دروازے پر تھا، دوسرا سینے پر۔ وہ منظر ایسا تھا جیسے صدیوں سے انتظار خود دروازے پر کھڑا ہو۔ہم کچھ دیر خاموش چلتے رہے۔ شاہ میر نے ہاتھ جیبوں میں ڈالے ہوئے تھے اور میں اپنے ہی خیالوں میں الجھا ہوا تھا۔ دروازہ پیچھے رہ گیا تو اس نے آہستہ سے پوچھا، ''اب کہاں؟''میں نے سیدھا جواب دیا، ''کوئٹہ۔''

وہ ایک لمحے کے لیے رکا، جیسے بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو، پھر بولا، ''اچانک کوئٹہ؟''میں نے چلتے ہوئے کہا،

''اچانک نہیں... بس وہاں جانا ہے۔ لاپتہ افراد کے کیمپ ہیں، مائیں ہیں، بہنیں ہیں... کچھ سوال ہیں جو کہیں اور نہیں ملیں گے۔'' شاہ میر نے سر ہلایا، مگر زیادہ کچھ نہ کہا۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے ارد گرد نظر دوڑائی اور شاہ میر سے پوچھا اڈا کتنا دور ہے۔ وہ آہستہ سے بولا، ''ہاں، بس تھوڑا آگے ہے... زیادہ دور نہیں۔ ہم تنگ گلیوں اور کچی پگڈنڈیوں سے نکلنے لگے۔ کہیں دیواروں کے سائے تھے، کہیں بند دکانوں کے شٹر، کہیں دور کسی چولہے کا دھواں اٹھ رہا تھا۔
کچھ دیر بعد ہم ایک پرانے سے ٹرک اڈے کے قریب پہنچے جہاں چند مزدا گاڑیاں، پک اپ اور مسافر وینیں کھڑی تھیں۔ شاہ میر نے ایک ڈرائیور سے بلوچی میں مختصر بات کی۔ ڈرائیور نے پہلے اسے غور سے دیکھا، پھر میری طرف دیکھا، پھر صرف اتنا کہا، پچھلی نشست پر بیٹھ جائیں ''ہم خاموشی سے گاڑی میں جا بیٹھے۔ اندر پہلے سے مختلف لوگ موجود تھے۔ ایک بوڑھا شخص تسبیح پھیر رہا تھا، ایک مزدور اپنے جوتے ہاتھ میں پکڑے اونگھ رہا تھا، ایک عورت دو بچوں کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ کسی نے کسی سے سوال نہ کیا۔ ایسے سفر خاموشی میں طے ہوتے ہیں۔ کھڑکی سے باہر وہی اڈے کی ہلکی سی گہما گہمی نظر آ رہی تھی، مگر میرے ذہن میں اب صرف وہی بات چل رہی تھی—لاپتہ افراد کے کیمپ، اور وہاں بیٹھے ہوئے سوال۔ گاڑی چل پڑی تو ہلکا سا جھٹکا لگا، جیسے ہم ایک جگہ سے نکل کر کسی اور دنیا میں داخل ہو رہے ہوں۔ راستے میں عام سی زندگی چل رہی تھی—دکانیں، رکشے، لوگ، شور... مگر ہمارے لیے اب یہ سب پس منظر تھا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر ہم کوئٹہ شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ جیسے ہی شہر کی حدود شروع ہوئیں، ماحول بدلنے لگا۔ سڑکیں زیادہ مصروف، گاڑیاں زیادہ، اور روشنیوں میں ایک ہلکی سی سردی۔ عشاء کا وقت ہو چکا تھا وہ لمحہ جب دن اور رات کے درمیان ایک خاموش سا وقفہ آ جاتا ہے، اور ہر چیز تھوڑی سنجیدہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ شاہ میر نے آہستہ سے کہا، ''یہاں اترتے ہیں...'' گاڑی ایک سادہ سی جگہ پر رکی۔ ہم دونوں نے اپنا سامان اٹھایا اور نیچے اتر گئے۔ باقی مسافر اپنی اپنی سمت چلے گئے، اور ہم سڑک کے کنارے چند لمحے خاموش کھڑے رہے۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، پھر شاہ میر سے کہا، ''رات یہیں کہیں رکنا ہوگا۔ پہلے آرام ضروری ہے، کل صبح کیمپ کی طرف جائیں گے۔'' وہ سر ہلا کر چل پڑا۔ ہم نے قریب ہی ایک سادہ سا ہوٹل دیکھا اور اسی طرف رخ کر لیا۔
ہوٹل زیادہ بڑا نہیں تھا، مگر صاف ستھرا تھا۔ دروازے کے اوپر مدھم سی روشنی جل رہی تھی اور اندر کاؤنٹر کے پیچھے ایک درمیانی عمر کا آدمی رجسٹر کھولے بیٹھا تھا۔ ہم دونوں خاموشی سے اندر گئے۔ شاہ میر نے مختصر انداز میں کہا، ''ایک کمرہ چاہیے، صرف ایک رات کے لیے۔''

اس آدمی نے ہمیں ایک نظر دیکھا، رجسٹر آگے بڑھایا اور نام لکھنے کو کہا۔ رسمی کارروائی کے بعد اس نے چابی ہماری

طرف بڑھا دی۔ ''اوپر دوسری منزل، دائیں طرف آخری کمرہ۔'' ہم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر گئے۔ دن بھر کی تھکن قدموں میں صاف محسوس ہو رہی تھی۔ کمرہ کھولا تو اندر سادگی تھی——دو بستر، ایک پرانا پنکھا، ایک میز، اور کھڑکی کے باہر شہر کی مدھم روشنی۔ میں نے بیگ ایک طرف رکھا اور گہرا سانس لیا۔ شاہ میر نے پانی کا گلاس بھر کر پیا، پھر بولا، ''پہلے کچھ کھا لیتے ہیں... پھر آرام کریں گے۔'' ہم نیچے آئے۔ ہوٹل کے چھوٹے سے ڈائننگ حصے میں سادہ کھانا ملا——روٹی، دال، سبزی اور چائے۔ ہم دونوں خاموشی سے کھاتے رہے۔ شاید بھوک سے زیادہ جسم کو سکون چاہیے تھا۔ کھانے کے بعد ہم دوبارہ کمرے میں آ گئے۔ باہر شہر کی آوازیں آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھیں۔ میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا، ''کل دن آسان نہیں ہوگا...'' شاہ میر نے چراغ بند کرتے ہوئے جواب دیا، ''یہاں کوئی دن آسان نہیں ہوتا۔'' کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ تھکن نے سوچوں کو آہستہ آہستہ خاموش کیا، اور کچھ ہی دیر بعد ہم دونوں اگلے دن کی فکر اپنے ساتھ لیے نیند میں ڈوب گئے۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے کی کھڑکی سے ہلکی دھوپ اندر آ رہی تھی۔ رات کی تھکن کچھ کم ہو چکی تھی، مگر ذہن کو معلوم تھا کہ آج کا دن آسان نہیں ہوگا۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا تو شاہ میر پہلے ہی تیار بیٹھا تھا، جیسے اسے نیند سے زیادہ مقصد نے جگایا ہو۔

ہم نیچے ہوٹل کے چھوٹے سے ہال میں آ گئے۔ وہاں سادہ سا ناشتہ ملا——چنے، پراٹھا اور گرم چائے۔ ہم دونوں خاموشی سے کھاتے رہے۔ کبھی کبھی ایسے دنوں میں انسان بات نہیں کرتا، صرف خود کو تیار کرتا ہے۔ ناشتہ ختم ہوا تو میں نے شاہ میر سے کہا، ''چلیں... آج دیکھتے ہیں وہاں کتنے سوال بیٹھے ہیں۔'' وہ میری بات سمجھ گیا۔ ہم ہوٹل سے باہر نکلے۔ صبح کا کوئٹہ آہستہ آہستہ جاگ رہا تھا۔ دکانیں کھل رہی تھیں، لوگ اپنے کاموں کو نکل رہے تھے، اور سڑکوں پر ہلکی سیف چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ کیمپ زیادہ دور نہیں تھا، اس لیے ہم نے سڑک کنارے کھڑے ایک رکشے کو اشارہ کیا۔ رکشہ رکا تو شاہ میر نے مختصر سا پتہ بتایا۔ ڈرائیور نے سر ہلایا اور ہم دونوں پیچھے بیٹھ گئے۔ رکشہ شہر کی سڑکوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ کبھی بازار آتا، کبھی کوئی سنسان موڑ، کبھی فوجی چیک پوسٹ نظر آتی، کبھی دیواروں پر لگے پوسٹر۔ ہر چیز جیسے اپنی اپنی کہانی رکھتی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد شاہ میر نے آہستہ سے کہا، ''بس آگے ہے...''

میرا دل بے وجہ بھاری ہونے لگا۔ شاید انسان بعض جگہوں پر پہنچنے سے پہلے ہی ان کا درد محسوس کر لیتا ہے۔

رکشہ ایک سادہ سی جگہ کے قریب رکا۔ سامنے چند خیمے، کچھ بینر، چند کرسیوں پر بیٹھی عورتیں، دو تین بزرگ مرد، اور کچھ نوجوان خاموش کھڑے تھے۔ یہ لاپتہ افراد کا کیمپ تھا۔ ہم نے کرایہ دیا، رکشے سے اترے، اور چند لمحے وہیں کھڑے منظر کو دیکھتے رہے۔ یہاں شور نہیں تھا... مگر خاموشی بہت اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے شاہ میر سے کہا، ''پہلے کسی ذمہ دار آدمی سے ملتے ہیں... جو یہاں بیٹھتا ہو، لوگوں کو جانتا ہو، ہمیں سمجھا سکے کہاں سے

بات شروع کریں۔" شاہ میر نے ارد گرد نظر دوڑائی، پھر خیمے کے قریب بیٹھے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔"شاید وہی ہوں... لوگ انہی کے پاس جا رہے ہیں۔" میں نے نظر اس طرف کی۔
ایک درمیانی عمر کا آدمی میز کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے رجسٹر تھا، کچھ کاغذات تھے، اور ایک موبائل جس پر بار بار کالز آ رہی تھیں۔ وہ کبھی کسی عورت کی بات سن رہا تھا، کبھی کسی کاغذ پر نوٹ لکھ رہا تھا۔ میں نے آہستہ قدموں سے اس کی طرف جانا شروع کیا۔
وہ ہمیں دیکھ کر تھوڑا سا سیدھا بیٹھ گیا۔ میں نے احترام سے کہا،"السلام علیکم... ہم باہر سے آئے ہیں، لوگوں کی بات سننے کے لیے۔ اگر اجازت ہو تو کچھ رہنمائی چاہیے۔" اس نے سر ہلایا،"وعلیکم السلام... آپ بیٹھ جائیں۔ یہاں ہر آدمی کو پہلے سننا ہوتا ہے، پھر سوال کرنا ہوتا ہے۔" میں نے کہا،
"ہمیں سمجھائیں... یہاں کیسز کیسے دیکھے جاتے ہیں؟ کون فیصلہ کرتا ہے؟ کون کس سے بات کر سکتا ہے؟" وہ تھوڑا سا رکا، پھر آہستہ سے بولا،"یہاں کوئی ایک فیصلہ کرنے والا نہیں ہوتا۔ ہم صرف ریکارڈ رکھتے ہیں، لوگوں کو بٹھاتے ہیں، اور ان کی آواز آگے متعلقہ اداروں، وکلا اور انسانی حقوق والوں تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔" میں نے پوچھا،
"اور سب سے زیادہ کون لوگ آتے ہیں؟" اس نے خیموں کی طرف دیکھا۔"مائیں... بہنیں... اور بوڑھے باپ۔ سب اپنے اپنے لاپتہ لوگوں کی تصویر لے کر آتے ہیں۔ کسی کے پاس جواب نہیں، صرف انتظار ہے۔" چند لمحے وہ خاموش رہا، پھر میز پر پڑی ایک پرانی فائل پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا،"یہاں سب سے مشکل چیز بھوک نہیں، گرمی نہیں، سردی نہیں... سب سے مشکل چیز امید کو زندہ رکھنا ہے۔ انسان جب سالوں تک دروازے کی آواز پر چونکے، ہر فون کال پر دل دھڑکے، ہر آنے والے چہرے کو غور سے دیکھے... تو آہستہ آہستہ وہ جینا نہیں، صرف انتظار کرنا سیکھ جاتا ہے۔" اس کے الفاظ میں بناوٹ نہیں تھی۔ لگتا تھا وہ یہ سب روز دیکھتا ہے۔
میں نے آہستہ سے پوچھا،
"کیا کبھی کوئی واپس بھی آیا ہے؟" اس نے میری طرف دیکھا، پھر نظریں جھکا لیں۔"کچھ آئے بھی ہیں... ٹوٹے ہوئے، خاموش، ڈرے ہوئے۔ کچھ کی خبریں آئی ہیں... اور کچھ صرف تصویروں میں رہ گئے۔ مگر زیادہ تر خاندان آج بھی سوال اور دعا کے درمیان بیٹھے ہیں۔"
میرے ہاتھ خودبخود نوٹ بک کی طرف گئے، مگر میں نے ابھی بھی اسے نہ کھولا۔ میں نے اگلا سوال کیا،"یہ لوگ آپ تک کیسے پہنچتے ہیں؟"
وہ بولا کوئی تربت سے آتا ہے، کوئی نوشکی سے، کوئی خضدار سے، کوئی مستونگ سے، کوئی آواران سے، کوئی سبی سے، کوئی پنجگور سے، کوئی گوادر سے، کوئی کیچ سے، کوئی چاغی سے، کوئی قلات سے ... کئی لوگ کرایہ جمع کر کے آتے ہیں،

کئی زیور بیچ کر۔ بعض صرف اس لیے آتے ہیں کہ شاید یہاں بیٹھنے سے کوئی سن لے۔" میں نے خیمے کے کونے میں بیٹھی ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا، جو ہاتھ میں تصویر تھامے خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے اشارے سے پوچھا" وہ...؟" اس نے میری نظر کا رخ پہچان لیا۔" وہ نسرین بلوچ ہے۔ چار سال سے اپنے بھائی کی تصویر لے کر آتی ہے۔ پہلے روتی تھی، اب خاموش بیٹھتی ہے۔ کچھ دکھ آنسوؤں سے آگے نکل جاتے ہیں۔" میں نے گہرا سانس لیا۔" اگر وہ اجازت دے... تو میں اس سے بات کرنا چاہوں گا۔اس نے فوراً جواب نہ دیا۔ پہلے اس نے مجھے غور سے دیکھا، جیسے یہ جانچ رہا ہو کہ میں خبر لینے آیا ہوں یا درد سننے۔ پھر آہستہ سے بولا،

" یہاں ہر آنے والے کو ہم کسی کے سامنے نہیں بٹھاتے۔ بہت لوگ آئے... تصویریں لیں، دو سوال کیے، چلے گئے۔ بعد میں نہ خبر آئی، نہ آواز۔ اس لیے اب ہم پہلے آدمی کو دیکھتے ہیں، پھر اجازت دیتے ہیں۔"

میں خاموشی سے سنتا رہا۔

میں نے سنجیدگی سے کہا،

"میں یہاں کسی کا دکھ بیچنے نہیں آیا۔ نہ کسی کے خلاف فیصلہ لکھنے آیا ہوں، نہ کسی کے حق میں۔ میں صرف سچ سننا اور سچ لکھنا چاہتا ہوں... تاکہ جو خاموش ہے، اس کی خاموشی بھی کہیں درج ہو جائے۔" اس کے چہرے پر پہلی بار نرمی آئی۔" اگر نیت یہی ہے... تو پھر بات ہو سکتی ہے۔ مگر ایک شرط ہے۔" میں نے فوراً کہا،" جی، فرمائیں۔" وہ بولا،

"سوال عزت سے کرنا... زخم چھیڑنے کے لیے نہیں، سمجھنے کے لیے۔ یہاں بیٹھے لوگ خبر نہیں، خاندان ہیں۔" میں نے سر جھکا کر کہا،" وعدہ ہے۔" اس نے ایک نوجوان رضاکار کو آواز دی جو قریب فائلیں ترتیب دے رہا تھا۔" بیٹا، نسرین بلوچ سے پوچھو... اگر طبیعت ہو تو یہ بھائی بات کرنا چاہتے ہیں۔ مجبور نہیں کرنا۔" وہ نوجوان آہستہ قدموں سے نسرین کے پاس گیا۔ کچھ دیر اس سے دھیمی آواز میں بات کرتا رہا۔ نسرین نے پہلے ہماری طرف دیکھا، پھر تصویر کو اپنے سینے سے لگایا، چند لمحے خاموش رہی، اور آخر ہلکے سے سر ہلا دیا۔ رضاکار واپس آیا۔

"وہ بات کرے گی... مگر زیادہ دیر نہیں۔" میں نے دل ہی دل میں خود کو سنبھالا۔اس آدمی نے میری طرف دیکھ کر کہا،

"جاؤ۔ پہلے سلام کرنا، پھر بیٹھنے کی اجازت لینا۔ یہاں گفتگو کھڑے ہو کر نہیں کی جاتی۔" اور ہاں یاد رکھو، یہاں سوال آہستہ پوچھے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں دل پہلے ہی بہت زور سے ٹوٹے ہوتے ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا،" شکریہ۔"

میں اور شاہ میر دھیرے قدموں سے نسرین کی طرف بڑھے۔ ہر قدم کے ساتھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کسی انسان کے قریب نہیں... ایک زندہ زخم کے قریب جا رہے ہوں۔

وہ چادر پر بیٹھی تھی۔ ہاتھوں میں ایک تصویر تھی جس کے کنارے بار بار چھونے سے گھس چکے تھے۔ اس کی نظریں تصویر پر تھیں، جیسے وہ چہرہ اب بھی اس سے بات کرتا ہو۔ ہم قریب پہنچے تو میں نے مناسب فاصلے پر رک کر نرمی سے کہا، ''السلام علیکم بہن۔ اگر اجازت ہو تو بیٹھ جاؤں؟'' اس نے سر اٹھایا۔ چند لمحے مجھے دیکھا، پھر آہستہ سے جواب دیا، ''وعلیکم السلام... جی، بیٹھ جائیں۔'' میں زمین پر اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ شاہ میر تھوڑا پیچھے خاموش کھڑا رہا۔

میں نے جلدی نہ کی۔ پہلے چند لمحے خاموشی رہنے دی، پھر دھیرے لہجے میں کہا، ''میرا نام ذیشان ہے۔ میں پنجاب سے آیا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی بات سننا چاہتا ہوں جتنی آپ کہنا چاہیں، اتنی ہی۔'' اس نے تصویر کو مضبوطی سے تھاما۔ ''باتیں تو بہت ہیں... سننے والے کم ہیں۔'' میں نے سر جھکا کر کہا، ''آج میں سننے آیا ہوں۔''
وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر تصویر میری طرف ذرا سی بڑھائی۔ ''یہ میرا بھائی ہے یوسف بلوچ۔'' میں نے تصویر کو احترام سے دیکھا۔ ایک نوجوان چہرہ، ہلکی مسکراہٹ، آنکھوں میں زندگی۔ میں نے آہستہ سے پہلا سوال کیا، ''یہ کب سے لاپتہ ہے؟'' اس نے بغیر سوچے جواب دیا ''چار سال، سات مہینے... اور بارہ دن۔'' میں چونکا نہیں، مگر دل ہل گیا۔ کچھ دکھ تاریخ نہیں بھولنے دیتے۔ میں نے نرمی سے پوچھا،
''آخری بار کب دیکھا تھا آپ نے؟'' اس کی نگاہ کہیں دور چلی گئی۔ ''وہ صبح روز کی طرح کام پر نکلا تھا کہہ کر گیا تھا دوپہر تک واپس آ جاؤں گا۔ امی نے کہا جلدی آنا... اس نے ہنس کر کہا، ہاں۔ پھر وہ ہنسی گھر میں رہ گئی... وہ خود نہیں آیا۔ پھر میں نے آہستہ سے پوچھا، ''بہن... آپ اصل میں کہاں سے ہیں؟ کون سا علاقہ ہے آپ کا؟'' وہ تصویر سے نظریں ہٹا کر مجھے دیکھنے لگی، جیسے یہ سوال اس کے لیے نیا بھی نہیں تھا اور پرانا بھی زخم کی طرح موجود تھا۔

''تربت...'' اس نے بہت آہستہ جواب دیا۔ ''ہم وہیں سے ہیں... وہی ہمارا گھر تھا۔'''' میں نے نرمی سے اگلا سوال رکھا، ''کیا آپکے بھائی کی کسی سے دشمنی تھی؟ کسی جماعت، تنظیم یا جھگڑے سے تعلق؟ وہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھی۔ ''نہیں۔ وہ محنت کرتا تھا۔ گھر چلاتا تھا۔ اگر قصور تھا تو ہمیں بتایا جاتا... مگر یہاں کئی گھروں کو صرف غائب کر دیا جاتا ہے، سمجھایا نہیں جاتا۔'' میں نے چند لمحے توقف کیا، پھر احتیاط سے پوچھا، ''آپ کو کس پر شک ہوا؟ اگر کہنا چاہیں تو...'' اس نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا،
''شک؟ یہاں شک بھی ڈر ڈر کے کیا جاتا ہے۔ کچھ کہتے ہیں ادارے لے گئے، کچھ کہتے ہیں راستے سے دوسرے لوگ اٹھا لے گئے، کچھ کہتے ہیں غلط نام دے دیا گیا۔ ہمیں آج تک کسی نے سچ نہیں بتایا۔'' اس نے تصویر سینے سے لگا لی ''ہمیں بس اتنا معلوم ہے... ایک بھائی گیا تھا، اور پورا گھر ساتھ لے گیا۔''
میں نے اس کے الفاظ خاموشی سے سنے۔ کچھ جواب ایسے ہوتے ہیں جن کے بعد فوراً دوسرا سوال کرنا بے حسی لگتا

ہے۔ میں نے چند لمحے سر جھکائے رکھا، پھر نرم لہجے میں کہا،"اگر آپ کو مشکل نہ ہو... میں کچھ اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ صرف اس لیے تاکہ بات ادھوری نہ رہ جائے۔" نسرین نے ہلکا سا سر ہلایا۔

میں نے ذرا قریب ہو کر، مگر احترام کا فاصلہ رکھتے ہوئے پوچھا،"جب وہ واپس نہیں آیا... تو سب سے پہلے آپ لوگوں نے کیا کیا؟"اس نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا،"پہلے ہم نے رشتے داروں کو فون کیے۔ پھر دوستوں کو ڈھونڈا۔ رات تک خود بازاروں میں پھرتے رہے۔ اگلے دن تھانے گئے... پھر ایک دفتر، پھر دوسرے دفتر۔ ہر جگہ ایک ہی جواب ملا— پتہ کرتے ہیں۔"میں نے آہستہ سے اگلا سوال کیا،"کیا کسی نے ایف آئی آر درج کی؟ یا کوئی باقاعدہ شکایت سنی گئی؟"

وہ ہلکی سی کڑواہٹ سے مسکرائی۔"درخواستیں بہت دیں... سنوائی کم ہوئی۔ کاغذ لیتے رہے، جواب نہیں دیتے رہے۔"میں نے کچھ توقف کیا، پھر نہایت احتیاط سے پوچھا،

"ان برسوں میں گھر پر کیا گزری؟"اس کی آنکھیں پہلی بار بھر آئیں، مگر آواز قائم رہی۔"امی بیمار رہنے لگیں۔ ابا کم بولتے ہیں۔ چھوٹے بہن بھائی عید پر بھی خوش نہیں ہوتے۔ ہم نے جینا نہیں چھوڑا... مگر پہلے جیسا جینا ختم ہو گیا۔"میں نے سر جھکا لیا۔

پھر آخری سوال کی طرف بڑھتے ہوئے کہا،"اگر آج آپ کی آواز حکومت، اداروں، اور پورے ملک تک پہنچے... تو آپ کیا کہنا چاہیں گی؟"نسرین نے تصویر دونوں ہاتھوں سے تھامی، سیدھی بیٹھی، اور بولی،"اگر قصور ہے تو عدالت میں لاؤ۔ اگر بے قصور ہے تو گھر بھیجو۔ مگر ماں باپ کو قبر اور دروازے کے درمیان مت لٹکاؤ۔ ہمیں صرف سچ دے دو... ہم باقی دکھ خود اٹھا لیں گے۔"

میں نے آہستہ سے نوٹ بک بند کی، پھر نرم لہجے میں کہا،"بہن... آپ نے بہت حوصلے سے بات کی۔ شکریہ۔"نسرین بلوچ نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی، مگر لہجہ مضبوط۔"شکریہ مجھے نہیں... اگر کچھ کر سکتے ہو تو اُن لوگوں کو کہنا جو بڑے کمروں میں بیٹھتے ہیں... ایک دن اپنی کرسی چھوڑ کر کسی ماں کے پاس بیٹھیں، پھر فیصلہ کریں درد کیا ہوتا ہے۔"

میں خاموش رہ گیا۔وہ پھر بولی،"اور اگر لکھتے ہو... تو ہمیں صرف خبر بنا کر نہ لکھنا۔ ہم بھی انسان ہیں، تصویروں کے نیچے لکھا ہوا نام نہیں۔"

اس جملے نے میرے دل پر جیسے دستک دی۔میں نے سنجیدگی سے کہا،"وعدہ ہے۔ آپ کی بات کو وزن دے کر لکھوں گا، رحم مانگتی کہانی بنا کر نہیں۔"اس کے چہرے پر پہلی بار ہلکی سی تھکن بھری مسکراہٹ آئی۔ پھر اس نے تصویر کو دیکھا، انگلی سے اس کے کنارے کو سیدھا کیا، اور بہت آہستہ سے روتے ہوئے بولی،"اگر کبھی میرا بھائی یہ پڑھ لے... تو اسے کہنا امی نے اس کا بستر آج تک نہیں سمیٹا۔"یہ الفاظ سن کر میرے ہاتھ بے اختیار کانپ گئے۔شاہ

میر نے روتے ہوئے نظریں دوسری طرف کر لیں۔
میں نے آہستہ سے کہا،''اللہ کرے وہ خود آ کر سن لے۔''
نسرین نے آسمان کی طرف دیکھا۔''آمین... یا پھر کم از کم سچ آ جائے۔''میں اٹھنے لگا تو اس نے مجھے روکا۔''بھائی...''
میں دوبارہ جھک گیا۔وہ بولی،
جب واپس جاؤ''اپنے پنجاب والوں سے کہنا ہم عام لوگوں کو قصوروار نہیں کہتے۔ درد وہاں سے ملا ہے جہاں اختیار تھا، مگر رحم نہ آیا۔''میں جواب نہ دے سکا۔ صرف سر جھکا دیا۔ بعض فریادیں لکھی نہیں جاتیں... اٹھائی جاتی ہیں۔

ہم کیمپ کے ایک کنارے کی طرف بڑھے، جہاں درختوں کے سائے گہرے ہو رہے تھے، وہاں ایک بزرگ بیٹھے تھے، چہرے پر دھوپ کے نشان اور ہاتھ میں ایک پرانی سی فائل، میں نے احترام سے کہا''السلام علیکم بابا جی... اگر اجازت ہو تو بیٹھ جائیں؟''انہوں نے ہلکی سی نگاہ اٹھائی''بیٹھ جاؤ بیٹا... یہاں اجازت کوئی نہیں مانگتا، صرف درد بیٹھتا ہے''ہم بیٹھ گئے، میں نے پہلا سوال کیا''آپ کہاں سے آئے ہیں؟''وہ فائل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے''نوشکی سے... میرا بیٹا مزدور تھا، اسکا نام بختار بلوچ ہے کانوں میں کام کرتا تھا، تین سال پہلے نکلا تھا، پھر واپس نہیں آیا''میں نے پوچھا''کبھی کوئی خبر ملی؟''انہوں نے آہستہ سے سر ہلایا''ایک بار کہا گیا تھا کہ کسی راستے میں دیکھا گیا ہے... دوسری بار کہا گیا غلط فہمی ہے، ہم نے ہر بار امید رکھی مگر ہر بار امید تھک گئی''میں نے اگلا سوال نرمی سے رکھا ''آپ نے پہلے کیا کیا تھا جب وہ واپس نہیں آیا؟''وہ تھوڑا سا رک گئے''ہم نے پہلے اپنے ساتھی مزدوروں سے پوچھا، پھر ٹھیکیدار سے، پھر تھانے گئے، ہر جگہ ایک ہی بات تھی 'پتہ کریں گے' مگر کسی نے ہمیں واپس نہیں بلایا'' میں نے پوچھا''اب آپ روز یہاں کیوں آتے ہیں؟''وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے''کیونکہ گھر میں بیٹھوں تو دیواریں سوال کرتی ہیں، یہاں آتا ہوں تو کم از کم میرے جیسے لوگ ہوتے ہیں، خاموشی بانٹنے والے''میں نے ان کی طرف دیکھا اور آہستہ سے پوچھا''بابا جی... آپ کو کبھی یہ لگا کہ اس کے پیچھے کسی کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟ کسی سردار، کسی وڈیرے یا کسی تنظیم کا؟''انہوں نے فوراً سر ہلا دیا''نہیں بیٹا... ہمیں کچھ نہیں پتہ، ہمیں نہ کسی سے دشمنی ہے نہ کسی پر الزام، ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ گیا تھا اور واپس نہیں آیا، ہمیں کسی کے نام نہیں چاہیے، ہمیں صرف اپنا بچہ چاہیے، اس نے کسی سے کوئی لڑائی نہیں کی نہ کسی کے خلاف تھا، وہ تو صرف مزدور تھا، روٹی کمانے گیا تھا''اس کی آواز گ بھاری ہو گئی مگر آنکھیں خشک رہیں، جیسے آنسو بھی تھک گئے ہوں۔میں خاموش بیٹھا اس کی بات سنتا رہا۔ کیمپ کی ہوا میں ایک عجیب سی سنجیدگی تھی، جیسے ہر لفظ اپنے وزن کے ساتھ گر رہا ہو۔پھر میں نے آہستہ سے کہا،

''بابا جی... آپ اکیلے نہیں ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی بات آگے لے جاؤں گا، لکھوں گا... جہاں تک

ممکن ہوا، آپ کی آواز پہنچاؤں گا۔" وہ چند لمحے مجھے دیکھتے رہے، جیسے میرے لفظوں کو تول رہے ہوں۔ پھر آہستہ سے بولے،

"بیٹا... آوازیں بہت جاتی ہیں یہاں سے... مگر اکثر راستے میں ہی تھک جاتی ہیں۔"

میں نے نرمی سے جواب دیا،

"اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ میں وعدہ نہیں کرتا کہ سب بدل دوں گا... مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ کی بات خاموش نہیں رہے گی۔" "میں اپکا مقدمہ لڑوں گا۔ یہ سن کر وہ بزرگ تھوڑا سا رکے، پھر دھیرے سے بولے،

"اگر تم واقعی لکھتے ہو تو بس ایک بات یاد رکھنا... ہم کسی کے دشمن نہیں ہیں۔ ہم صرف اپنے بچوں کے انتظار میں زندہ ہیں۔" میں نے سر جھکا کر کہا،

"میں آپ کی بات کو امانت سمجھ کر لے جاؤں گا۔" انہوں نے پہلی بار میرے سر پر ہاتھ رکھا، "اللہ تمہیں سچا رکھے بیٹا... اور اگر تم جھوٹ نہیں لکھتے تو تمہیں کبھی خاموشی کا بوجھ نہیں اٹھانا پڑے گا۔" اسی وقت وہ نوجوان جو ان کے ساتھ بیٹھا تھا، آہستہ سے کھڑا ہوا۔ اس نے میری طرف دیکھا، پھر تھوڑا ہچکچا کر بولا، "بھائی... یہاں سب یہی کہتے ہیں کہ لکھو گے... مگر پہلے بھی بہت لوگ آئے تھے۔" میں نے اس کی طرف دیکھا، "اور وہ لکھ کر گئے بھی تھے یا صرف سن کر گئے تھے؟"

وہ خاموش ہو گیا۔ یہی خاموشی سب سے بڑا جواب تھا۔ میں نے نرمی سے کہا "اگر تم چاہو تو تم بھی بات کر سکتے ہو۔ ہر آواز الگ ہوتی ہے، مگر درد ایک جیسا ہوتا ہے۔ وہ تھوڑا خاموش ہوا، پھر بولا، "میرا بھائی بھی لاپتہ ہے..." اور آہستہ سے بیٹھ گیا، مگر اب اس کی آنکھوں میں سوال زیادہ تھے۔

میں نے حیرانگی سے اس نوجوان کی طرف دیکھا اور پوچھا، "تمہارا نام کیا ہے؟" وہ تھوڑا سا سیدھا بیٹھا، "ساجد بلوچ..." "تم کدھر سے ہو؟" وہ دھیمے لہجے میں بولا "کلات سے..." میں نے سر ہلایا اور پوچھا، "ساجد... تمہاری تعلیم کیا ہے؟" وہ نظریں نیچے کرتے ہوئے بولا، "زیادہ نہیں... بس اسکول تک پڑھا ہوں... پھر گھر کے حالات کی وجہ سے کام شروع کر دیا تھا۔" میں نے اگلا سوال کیا، "تم کیا کام کرتے ہو؟" وہ آہستہ سے بولا، "یہیں کبھی مزدوری، کبھی چھوٹے موٹے کام..." میں نے ایک لمحہ توقف کیا، پھر پوچھا، "تم نے بتایا تھا تمہارا بھائی بھی لاپتہ ہے... اس کے بارے میں بتاؤ۔" اس نے گہری سانس لی، "میرا بڑا بھائی... رحیم بلوچ... وہ کوئٹہ میں میڈیکل کا طالب علم تھا۔" میں نے پوچھا، "کب سے لاپتہ ہے؟" وہ آہستہ سے بولا، "ڈیڑھ سال ہو گئے ہیں...

میں نے اگلا سوال نرمی سے کیا، "اس دن کیا ہوا تھا؟ آخری بار تم نے کب بات کی تھی؟"

وہ لمحہ بھر کو رکا، "رات کو بات ہوئی تھی...وہی عام روٹین کے مطابق چند باتیں اور پھر اس نے کہا تھا کہ صبح کالج جانا ہے اس کے بعد اس کا فون بند ہو گیا پھر اس کے بعد

کبھی آن لائن نہیں ہوا۔" کوئی رابطہ نہیں ہوا میں نے شائستگی سے پوچھا، "اس دن کے بعد تم نے کیا کیا؟" وہ تھوڑا سا رک گیا، "ہم نے پہلے دوستوں سے پوچھا... پھر کالج گئے... پھر ہر اس جگہ گئے جہاں وہ جاتا تھا... مگر کوئی واضح بات نہیں ملی۔ ہر کوئی صرف یہی کہتا ہے کہ چیک کریں گے۔ میں نے آہستہ سے سوال رکھا، "تمہیں خود کیا لگتا ہے... وہ اچانک کیسے غائب ہو سکتا ہے؟" وہ لمبی خاموشی کے بعد بولا، "ہمیں نہیں معلوم... بس اتنا ہے کہ وہ ایسا نہیں تھا کہ بغیر بتائے چلا جائے۔ وہ اپنے گھر، اپنی پڑھائی، سب کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔" میں نے اگلا سوال کیا، کیا تم نے کبھی یہ سوچا کہ اس واقعے کے پیچھے کوئی شخص، گروہ یا ادارہ ذمہ دار ہو سکتا ہے؟ وہ فوراً بولا، "نہیں... ہم نے کبھی کسی کا نام نہیں لیا۔ ہمیں الزام نہیں چاہیے، ہمیں جواب چاہیے۔ ہم شکایت نہیں کرتے، ہم بغاوت نہیں کرتے... ہم صرف انتظار کرتے ہیں، لیکن انتظار کی بھی ایک حد ہوتی ہے، اور جب وہ حد ٹوٹ جائے نا... تو پھر انسان اندر سے خالی ہو جاتا ہے۔" میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا، "اگر تمہیں موقع ملے کہ تم کسی کو براہِ راست سوال کر سکو، تو تم کیا پوچھو گے؟" وہ پہلی بار سیدھا ہوا، "میں صرف یہ پوچھوں گا کہ میرا بھائی کہاں ہے... زندہ ہے یا نہیں... بس اتنا سچ بتا دیں، کیونکہ بے خبری میں جینا سب سے بڑا درد ہے۔" میں نے آخری سوال رکھا، "اور اگر وہ آج واپس آ جائے؟" اس کی آواز ٹوٹنے لگی، "میں کچھ نہیں کہوں گا... بس اسے دیکھوں گا... کیونکہ ہم نے اسے صرف انتظار میں دیکھا ہے، حقیقت میں نہیں۔" وہ خاموش ہو گیا اور اس بار خاموشی صرف اس کی نہیں تھی... بلکہ پورے خیمے کی تھی۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا، پھر آہستہ سے بولا،

"بھائی... تم پنجاب سے آئے ہو نا؟" میں نے سر ہلایا، "ہاں..."

اس نے ایک ہلکی سی سانس لی، جیسے دل پر رکھا ہوا بوجھ لفظوں میں ڈھل رہا ہو،

"جس خلوص سے تم یہاں تک آئے ہو... امید ہے اسی خلوص سے تم ہماری بات بھی لے جاؤ گے... اور صرف سن کر نہیں جاؤ گے، کہیں لکھ کر بھی جاؤ گے..." میں نے نرمی سے کہا، "میں تبدیلی کا دعویٰ نہیں کر سکتا... لیکن تمہارا درد نظر انداز نہیں ہونے دوں گا۔" وہ تھوڑا سا خاموش ہوا، پھر دھیرے سے بولا، "بس یہی کافی ہے بھائی... ہمیں بڑے بڑے وعدے نہیں چاہییں... ہمیں بس یہ چاہیے کہ کوئی ہماری بات کو سنجیدگی سے لے... ہمارے درد کو مذاق نہ سمجھے کیونکہ ہم نے بہت دفعہ اپنی آواز دی ہے، مگر ہر بار وہ راستے میں کہیں کھو گئی ہے..." میں نے اس کی بات خاموشی سے سنی۔ اس کے الفاظ میرے نوٹ بک میں نہیں، میرے ذہن میں لکھے جا رہے تھے۔ وہاں سے اٹھنے کے بعد میں نے کیمپ کے مختلف حصوں کا رخ کیا۔

انٹرویو ختم نہیں ہوئے تھے، مگر کہانی اپنے آپ میں مکمل ہو چکی تھی۔ ایک ماں کی آواز، ایک باپ کا انتظار، ایک بہن

کا سوال، اور ایک بھائی کی بے چینی — یہ سب مل کر ایک ہی تصویر بنا رہے تھے۔
میں نے کیمپ میں مزید چند لوگوں سے بات کی۔ ہر کسی کی کہانی مختلف تھی، مگر درد ایک ہی تھا۔ کسی کو سالوں سے جواب نہیں ملا تھا، اور کسی کے پاس صرف سوال بچے تھے۔
کیمپ سے باہر آکر بھی وہ چہرے، وہ آوازیں اور وہ جملے میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے صرف لوگوں سے بات نہیں کی بلکہ ایک پورے خطے کے انتظار کو لفظوں میں سن لیا ہو۔
شاہ میر کچھ فاصلے پر کھڑا تھا، مگر میں اپنے ہی خیالات میں گم تھا۔ میں نے نوٹ بک کھولی اور لکھتے ہوئے خود سے کہا کہ یہ صرف ملاقاتیں نہیں تھیں، یہ ایک ایسے مقدمے کی گواہیاں تھیں جس میں فریق واضح نہیں مگر درد ہر جگہ موجود ہے۔

یہ بلوچستان کا مقدمہ تھا۔۔ مگر کٹہرے میں کوئی ایک نہیں تھا، یہاں ہر چہرہ اپنا اپنا بیان دے رہا تھا، اور ہر آنکھ اپنے گمشدہ حصے کی تلاش میں تھی۔ میں نے وہاں جتنے بھی لوگوں سے بات کی، ان سب کی ایک بات مشترک تھی — وہ کسی سے دشمنی یا الزام نہیں رکھتے تھے، نہ کسی کے خلاف نعرہ لگاتے تھے۔ ان کا مطالبہ صرف اتنا تھا کہ ان کے پیاروں کے بارے میں کوئی واضح جواب دیا جائے، تاکہ انتظار ختم ہو سکے۔ یہ تمام گفتگو کسی ایک فریق پر الزام لگانے کے لیے نہیں تھی، بلکہ ایک بڑے انسانی مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایک ایسا مسئلہ جہاں خاندان برسوں سے اپنے پیاروں کی راہ دیکھ رہے ہیں، اور وقت صرف گزرتا جا رہا ہے۔ یہ کہانی کسی فیصلے یا نتیجے کے طور پر نہیں لکھی جا رہی، بلکہ ایک سوال کے طور پر سامنے رکھی جا رہی ہے۔ یہ سوال صرف کیمپ تک محدود نہیں، بلکہ پورے معاشرے کے لیے ہے — کہ آخر اتنے خاندان آج بھی اپنے پیاروں کی واپسی کے انتظار میں کیوں ہیں؟ اور اس انتظار کی کوئی حد، کوئی انجام کیوں نظر نہیں آتا؟ یہ بات ریاست، اداروں اور معاشرے — سب کے سامنے ایک انسانی سوال کے طور پر رکھی جا رہی ہے، نہ کہ کسی الزام کے طور پر۔ کیونکہ یہاں مسئلہ کسی ایک شخص یا ایک فریق کا نہیں، بلکہ ان بے شمار خاموش آوازوں کا ہے جو برسوں سے صرف ایک جواب کی منتظر ہیں۔ آخر میں ایک ہی بات رہ جاتی ہے اگر کسی کی آواز گم ہو جائے تو اسے سننے اور ڈھونڈنے کی ذمہ داری کس کی ہے؟ اور اگر انتظار ہی زندگی بن جائے تو اس کا اختتام کون لکھتا ہے؟

میں دوبارہ اس ذمہ دار شخص کی طرف چل پڑا جس سے تھوڑی دیر پہلے ملاقات کر چکا تھا۔ وہ ذمہ دار شخص اب بھی اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے آتے دیکھا تو ہلکا سا سر اٹھایا، جیسے پہلے ہی جانتا ہو کہ میں واپس آؤں گا۔ میں قریب پہنچا تو اس نے سیدھا مجھ سے پوچھا، ''ہاں بھائی... ہو گئی بات چیت؟ سب سے مل لیا آپ نے؟'' میں نے ایک لمحہ

خاموش رہ کر سر ہلایا،
''جی... سب سے بات ہو گئی ہے۔''پھر میں نے بات کو مزید اگے بڑھاتے ہوتے ہوئے کہا میں نظام کے حوالے سے۔کچھ چیزیں سمجھنا چاہتا ہوں،''
اس نے کہا،''جی، پوچھیں۔''
میں نے نوٹ بک کھولی،''یہ کیمپ عملی طور پر کیسے چلتا ہے؟ روزمرہ کا انتظام،ریکارڈنگ اور کیسز کی درجہ بندی کیسے کی جاتی ہے؟''وہ تھوڑا سا سیدھا بیٹھا،''یہاں آنے والے ہر فرد کی بنیادی معلومات لی جاتی ہیں، ان کا کیس رجسٹر کیا جاتا ہے، اور پھر اسے مختلف سطحوں پر نوٹ کیا جاتا ہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ ہر کیس کا ریکارڈ محفوظ رہے تاکہ بعد میں ٹریس کیا جا سکے۔''میں نے اگلا سوال کیا،
''اور یہ ریکارڈ آگے کہاں جاتا ہے؟ کس کو منتقل کیا جاتا ہے؟ اور follow-up کا کوئی واضح طریقہ کار ہے؟''اس نے آہستہ سے جواب دیا،''یہ کیس کی نوعیت پر depend کرتا ہے۔ کچھ قانونی اداروں کو جاتے ہیں، کچھ انسانی حقوق کے نیٹ ورک تک، اور کچھ براہِ راست متعلقہ محکموں تک پہنچائے جاتے ہیں۔ مگر ہر کیس کا جواب ہمارے پاس واپس نہیں آتا۔'' میں نے اگلا سوال رکھا،''لوگ اکثر پوچھتے ہیں کہ یہاں اخراجات اور انتظامی سپورٹ کیسے چلتی ہے؟ کیا کوئی مستقل ذریعہ ہے یا رضاکارانہ تعاون؟''''اس نے جواب دیتے ہوئے کہا،''یہ زیادہ تر رضاکارانہ بنیادوں پر چلتا ہے۔ کچھ لوگ خود مدد کرتے ہیں، کچھ تنظیمیں یا عام شہری۔ یہ کوئی کاروبار یا سیاسی ادارہ نہیں۔''میں نے اگلا سوال رکھا،''اور سب سے بڑا انتظامی چیلنج کیا ہوتا ہے؟ کیسز کی تعداد، وسائل یا دباؤ؟''اس نے گہری سانس لی،''سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ کیسز رکنے کا نام نہیں لیتے ہر دن نئے لوگ آتے ہیں، اور ہر نیا کیس پچھلے کیس کے ساتھ جڑ جاتا ہے ریکارڈ بڑھتا جاتا ہے، مگر جواب نہیں بڑھتے۔میں نے نرمی سے پوچھا،''کیا کبھی آپ پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ آواز کہاں تک پہنچتی ہے؟ کیا واقعی کہیں سنی بھی جاتی ہے؟''اس نے کیمپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،''ہمیں نہیں پتا کہ کہاں سنی جاتی ہے... لیکن ہم یہاں اس امید پر بیٹھے ہیں کہ شاید کہیں نہ کہیں کوئی سچ تک پہنچ جائے۔ اگر ہم خاموش ہو جائیں تو پھر ہمارے پاس رہ کیا جائے گا؟''''میں نے کچھ دیر خاموشی اختیار کی، پھر آخری سوال کیا،''اور اگر کوئی یہ پوچھے کہ آخر حل کیا ہے... تو آپ کیا کہیں گے؟''اس نے پہلی بار سیدھا میری طرف دیکھا،''حل ہمارے پاس نہیں ہوتا... حل وہاں ہوتا ہے جہاں یہ مسئلہ ختم ہو۔ ہم صرف درمیان میں کھڑے ہیں، جہاں سوال بھی ہیں اور انتظار بھی۔''

وہ پہلی بار خاموش ہوا، پھر میری طرف غور سے دیکھ کر بولا،''بھائی... تم نے آج بہت کچھ سن لیا ہے۔ اب یہ تم پر ہے کہ ان باتوں کو بوجھ بنا کر لے جاتے ہو... یا امانت سمجھ کر۔'' میں نے آہستہ سے کہا،''میں کوشش کروں گا کہ جو

سنا ہے، اسے ایمانداری سے آگے رکھ سکوں۔ نہ کسی کا دکھ بڑھاؤں، نہ کسی کی بات چھپاؤں۔" اس نے سر ہلایا، "بس یہی کافی ہے۔ یہاں لوگ انصاف مانگتے مانگتے تھک گئے ہیں... اب کم از کم سچ ہی ان تک پہنچ جائے تو بھی غنیمت ہے۔" میں نے نوٹ بک بند کی اور کہا، "اگر دوبارہ ضرورت پڑی تو کیا میں پھر آ سکتا ہوں؟" وہ ہلکا سا مسکرایا، "دروازہ ہمارا بند نہیں ہوتا بھائی... بس آنے والے کم سچے ہوتے ہیں۔" میں نے احترام سے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے مضبوطی سے ہاتھ تھاما۔ "اللہ آسانی کرے آپ سب کے لیے۔" وہ بولا، "اور تمہارے لیے بھی... کیونکہ بعض دفعہ سننے والا بھی اتنا ہی تھک جاتا ہے جتنا سنانے والا۔" میں نے سر جھکایا، سلام کیا، اور آہستہ قدموں سے وہاں سے نکل آیا۔ خیموں کی وہ بوجھل خاموشی میرے اعصاب پر سوار تھی جب میں شاہ میر کے ساتھ باہر سڑک پر آیا۔ میں نے رک کر شاہ میر کی طرف دیکھا، جو خاموشی سے سگریٹ سلگا رہا تھا۔ "شاہ میر!" میں نے اسے پکارا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "تم نے کہا تھا نا کہ سچ کے کئی رنگ ہوتے ہیں؟" میں نے اپنی نوٹ بک جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں نے وہ آنکھیں دیکھ لیں جو انتظار کر رہی ہیں۔ اب میں وہ گھر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں سے امید بھی رخصت ہو چکی ہے۔"

شاہ میر نے ایک گہرا کش لیا اور دھواں فضا میں اچھالتے ہوئے بولا، "تمہارا اشارہ کس طرف ہے ذیشان بھائی؟" "اسی شہر کے مضافات میں وہ مزدوروں کی بستی ہے نا، جہاں پچھلے مہینے حملہ ہوا تھا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "اور وہ بلوچ خاندان بھی، جن کے پیاروں کو 'مخبری' کے شک میں پہاڑوں پر لے جا کر ذبح کر دیا گیا۔ مجھے وہاں جانا ہے۔ مجھے اس سچ کا دوسرا رخ بھی دیکھنا ہے جسے اکثر سیاست کی دھول میں چھپا دیا جاتا ہے۔" شاہ میر کے چہرے پر ایک عجیب سی لہر دوڑی۔ اس نے سگریٹ نیچے پھینک کر پاؤں سے مسل دیا اور دھیمی آواز میں بولا، "راستہ کٹھن ہے ذیشان صاحب۔ وہاں تمہیں وہ لوگ ملیں گے جن کا دشمن ریاست نہیں، بلکہ وہ 'اپنے' ہیں جو آزادی کے نام پر اپنوں ہی کا خون بہا رہے ہیں۔ چلو، اگر تم نے ٹھان ہی لی ہے تو میں تمہیں سچ کے اس اندھیرے غار میں بھی لے چلتا ہوں۔" ہم نے ایک رکشہ لیا اور کوئٹہ کے مضافاتی علاقے کی طرف چل پڑے، جہاں کچے مکانوں اور تنگ گلیوں میں وہ لوگ آباد تھے جن کی زندگی کی اوقات ایک گولی سے زیادہ نہ تھی۔

کچھ دیر بعد ہم ایک ایسی گلی میں تھے جہاں ہر دیوار پر خوف کے سائے تھے۔ شاہ میر مجھے ایک چھوٹے سے کوارٹر کے سامنے لے گیا۔ "یہاں کرامت علی رہتا تھا،" شاہ میر نے ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "لودھراں سے آیا تھا۔ یہاں سڑک کٹائی کا کام کرتا تھا۔ تین ہفتے پہلے اسے اور اس کے دو ساتھیوں کو صرف اس لیے مار دیا گیا کیونکہ ان کا تعلق پنجاب سے تھا۔" ہم نے اس بوسیدہ اور نیلے رنگ کے لوہے کے دروازے کے سامنے قدم روکے، جس پر

جگہ جگہ سے پینٹ اکھڑا ہوا تھا۔ شاہ میر نے ایک گہرا سانس لیا اور زنجیر کو آہستہ سے ہلایا۔ دستک کی آواز خاموش گلی میں کسی ماتم کی طرح گونجی۔ کچھ دیر خاموشی رہی، پھر اندر سے کسی کے چلنے کی دھیمی سی آواز آئی۔ ایک بوڑھی خاتون نے، جن کے سر پر سفید چادر تھی اور چہرے پر عمر بھر کی مشقت لکھی تھی، دروازہ ذرا سا کھولا۔ ان کی آنکھوں میں خوف کی ایک لہر دوڑی جو یہاں کے باسیوں کا مقدر بن چکی تھی۔شاہ میر نے نہایت شائستگی سے سر جھکایا، "اسلام علیکم خالہ۔ ہم مہمان ہیں۔ یہ لاہور سے آئے ہیں، کرامت کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتے تھے۔""لاہور سے؟" ان کے لہجے میں ایک دم اپنائیت اور دکھ کی ملی جلی کیفیت ابھری۔

انہوں نے ہمیں اندر آنے کا راستہ دے دیا اور دھیمی آواز میں بولیں، "آ جاؤ پتر، اندر آ جاؤ۔"کوارٹر بہت چھوٹا تھا۔ دو کمرے تھے باہر صحن کے ایک کونے میں کچھ برتن پڑے تھے اور دوسرے کونے میں ایک خالی چارپائی، جس پر کرامت کا سامان—ایک میلا سا تولیہ اور مزدوری والی جیکٹ—ابھی تک اسی طرح پڑی تھی جیسے وہ ابھی واپس آنے والا ہو۔ہم فرش پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ خالہ نے کانپتے ہاتھوں سے پانی کا گلاس ہماری طرف بڑھایا۔ میں نے پانی پینے کے بعد نہایت نرمی سے بات شروع کی، "خالہ، میرا نام ذیشان ہے۔ میں کرامت کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں تاکہ دنیا کو پتہ چلے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ اگر آپ ہمت کر سکیں تو ہمیں بتائیں کہ اس رات کیا ہوا تھا؟"خالہ نے اپنی چادر کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور خالی نظروں سے دیوار کو تکنے لگیں۔ "بیٹا، کرامت میرا اکلوتا سہارا تھا۔ لودھراں میں جب کام نہ ملا تو کہنے لگا 'ماں، بلوچستان میں سڑکیں بن رہی ہیں، وہاں دیہاڑی اچھی ملتی ہے، میں وہاں جا کر تیرے لیے پیسے جمع کروں گا'۔"تاکہ تیرا علاج اچھے سے ہو سکے

وہ ایک لمحے کو رکیں، جیسے وہ منظر ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہو۔ "تین ہفتے پہلے کی بات ہے۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ سب سو رہے تھے۔ اچانک گلی میں موٹر سائیکلوں کا شور ہوا۔ پھر ٹھاہ ٹھاہ کر کے دروازہ ٹوٹنے لگا۔ تین نقاب پوش اندر آئے۔ ان کے پاس بڑی بندوقیں تھیں۔ انہوں نے کرامت اور اس کے دو ساتھیوں کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا۔" میں نے پوچھا، "کیا انہوں نے کچھ کہا؟ کچھ پوچھا؟"خالہ کی ہچکی بندھ گئی، "وہ بس ایک ہی بات چلا کر کہہ رہے تھے، 'تم پنجابی ہو، یہاں سے نکل جاؤ، تم ایجنٹ ہو'۔ کرامت ہاتھ جوڑتا رہا، کہتا رہا 'باؤ جی، میں تو دیہاڑی دار ہوں، میرا کسی سے کیا لینا دینا'۔ مگر وہ جلاد تھے بیٹا، انسان نہیں تھے۔ وہ انہیں گھسیٹ کر باہر گلی میں لے گئے۔" ان کی آواز تھرتھرانے لگی، "میں پیچھے ننگے پاؤں بھاگی، ان کے پیروں میں گری، واسطے دیے، مگر انہوں نے مجھے ٹھوکر ماری۔ پھر گلی کے نکڑ پر میری آنکھوں کے سامنے... انہوں نے تینوں کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا اور... اور اندھا دھند گولیاں چلا دیں۔"کمرے میں ایک بھیانک خاموشی چھا گئی۔ شاہ میر نے نظریں جھکا لیں، شاید اسے شرمندگی محسوس

ہو رہی تھی کہ یہ کرنے والے اسی کی مٹی کے بیٹے کہلاتے تھے۔ میں نے اپنی لرزتی ہوئی آواز کو سنبھالا، "خالہ، کیا کسی تنظیم نے اس کی ذمہ داری لی؟ یا کوئی گرفتاری ہوئی؟" خالہ نے ایک سرد آہ بھری، "بیٹا، اگلے دن اخبار میں آیا کہ 'آزادی کے متوالوں' نے تین جاسوسوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ میرا بچہ جو ڈھنگ سے اپنا نام نہیں لکھ سکتا تھا، وہ جاسوس کیسے ہو گیا پولیس آئی تھی، پرچہ بھی کاٹا، لیکن یہاں تو موت مفت ہے بیٹا، انصاف بہت مہنگا ہے۔" انہوں نے چارپائی پر پڑی کرامت کی جیکٹ اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لی، "اب لودھراں واپس کیسے جاؤں؟ کس کے کندھے پر بیٹھ کر جاؤں؟ میں تو یہاں اپنے بچے کی قبر کی مجاور بن کر رہ گئی ہوں۔" میں نے نوٹ بک بند کر دی۔ آج پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ "مظلوم" کا کوئی صوبہ نہیں ہوتا۔ نسرین کا بھائی لاپتہ تھا تو اسے ریاست سے گلہ تھا، اور کرامت کی ماں کا بیٹا قتل ہوا تھا تو اسے ان "آزادی پسندوں" سے گلہ تھا جنہوں نے اسے یتیم کر دیا تھا۔ میں نے کرامت کی ماں کے لرزتے ہوئے ہاتھوں کو تھاما، جن میں اب بھی اپنے بیٹے کی وہ جیکٹ دبی ہوئی تھی جس میں مزدوری کے پسینے اور خون کی مہک رچی بسی تھی۔

میں نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا، "خالہ، آپ کا دکھ اتنا بڑا ہے کہ میں اسے بانٹ تو نہیں سکتا، لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کرامت کی یہ بے گناہی دنیا تک پہنچاؤں گا۔ اسے 'جاسوس' کہنے والوں کو بتانا پڑے گا کہ ایک غریب مزدور کا خون بہانا بہادری نہیں، بے غیرتی، ہے بزدلی ہے۔"

انہوں نے اپنی دھندلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا، جیسے میری باتوں میں اپنے لیے کوئی سہارا ڈھونڈ رہی ہوں۔ میں نے تھوڑا جھک کر پوچھا، "خالہ، اگر آپ کی آواز وہاں تک پہنچ سکے جہاں یہ فیصلے ہوتے ہیں، تو آپ ان تنظیموں یا ریاست سے کیا کہنا چاہیں گی؟" خالہ نے ایک لمبی سانس لی، ان کا چہرہ کرب سے بھر گیا۔ "میں ان 'آزادی' مانگنے والوں سے بس اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ پتر، کیا آزادی غریبوں کے سینے چھلنی کرنے سے ملتی ہے؟ اگر تم اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہو تو اس میں لودھراں کے ایک یتیم کا کیا قصور تھا؟ کیا اسے مار کر تمہارا قد اونچا ہو گیا؟"

وہ لمحہ بھر کو رکیں اور پھر چھت کی طرف دیکھ کر بولیں، "اور رہی ریاست... تو اس سے بس یہی گلہ ہے کہ جب میرے بچے کو مارا جا رہا تھا تو قانون کہاں تھا؟ کیا ہم صرف مرنے کے لیے اس دھرتی پر آئے ہیں؟ میرے بچے کا قصور صرف 'پنجابی' ہونا تھا، تو کیا اس صوبے میں پنجابی ہونا موت کا پروانہ ہے؟" کمرے میں حبس بڑھنے لگا تھا۔ شاہ میر، جو اب تک خاموش کھڑا تھا، آگے بڑھا اور جیب سے کچھ پیسے نکال کر چپکے سے چارپائی کے کونے پر رکھ دیے۔ خالہ نے دیکھ لیا اور انکار میں سر ہلا دیا، "نہیں پتر، یہ پیسے میرے کرامت کو واپس نہیں لائیں گے۔" شاہ میر نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا، "خالہ، یہ قیمت نہیں ہے، یہ ایک بلوچ بیٹے کی طرف سے معذرت ہے۔ ہمیں شرمندگی ہے کہ ہم آپ کے لعل کی حفاظت نہ کر سکے۔" میں نے احترام سے خالہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے میرے سر پر

ہاتھ پھیر کر دعا دی، "جیتے رہو پتر... سچ لکھنا، چاہے وہ کتنا ہی کڑوا کیوں نہ ہو۔ اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔" ہم بوجھل قدموں سے اس چھوٹے سے کوارٹر سے باہر نکل آئے۔ گلی میں اب بھی وہی پراسرار سا خوف پھیلا ہوا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، خالہ اب بھی چوکھٹ پر بیٹھی اسی جیکٹ کو سینے سے لگائے سامنے دیکھ رہی تھیں، جیسے کرامت اب بھی گلی کے موڑ سے نمودار ہونے والا ہو۔ شاہ میر نے رکشے کی طرف اشارہ کیا، "چلو ذیشان بھائی، اب مراد بلوچ کا گھر قریب ہی ہے۔ ایک اور ماں کا بیٹا مرا ہے، بس فرق یہ ہے کہ اس کا قاتل بھی بلوچ ہے اور مقتول بھی۔" میں رکشے میں بیٹھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس مٹی پر گرنے والے خون کا رنگ تو ایک ہی ہے، پھر یہ نفرت کی لکیریں کس نے کھینچیں۔

رکشہ کوئٹہ کے ایک اور پسماندہ علاقے کی تنگ گلیوں میں داخل ہوا، جہاں دیواروں پر جابجا چاکنگ ہوئی تھی اور فضا میں ایک عجیب سی گھٹن تھی۔ شاہ میر نے ایک کچی دیوار کے پاس رکشہ رکوایا۔ یہاں ایک سادہ سا مکان تھا جس کا دروازہ آدھا کھلا تھا، جیسے اس گھر کے مکینوں کو اب کسی چور یا لٹیرے کا خوف نہ رہا ہو—کیونکہ وہ اپنا سب سے قیمتی اثاثہ پہلے ہی کھو چکے تھے۔ شاہ میر نے دروازے کی لکڑی پر دستک دی، جو پہلے ہی اپنی جگہ سے ہلی ہوئی تھی۔ کچھ لمحوں بعد اندر سے ایک بھاری اور تھکی ہوئی آواز آئی، "کون ہے؟" دروازہ پورا کھلا اور ایک نوجوان باہر آیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بتاتے تھے کہ وہ مدتوں سے سویا نہیں ہے۔ شاہ میر کو دیکھ کر اس کے چہرے پر تھوڑی سی پہچان ابھری۔ شاہ میر نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، "مراد! میں شاہ میر ہوں۔ یہ ذیشان صاحب ہیں، لاہور سے آئے ہیں۔ ہمدرد انسان ہیں، تمہارے بھائی زبیر کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔"

مراد نے ایک سرد نظر مجھ پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں وہ بے اعتباری تھی جو ایک بلوچ کو کسی غیر مقامی شخص کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ میں نے فوراً قدم آگے بڑھایا اور دھیمے لہجے میں کہا، "مراد بھائی میں لاہور سے آیا ہوں، ایک لکھاری ہوں۔ میں نے نسرین بلوچ کا دکھ بھی سنا ہے اور لودھراں کی اس ماں کا بھی جس کا بیٹا کرامت مارا گیا۔ اب میں آپ کی بات سننے آیا ہوں تاکہ دنیا کو بتا سکوں کہ اس آگ میں کون کون جل رہا ہے۔" میرا لہجہ شاید اسے سچا لگا۔ اس نے خاموشی سے راستہ چھوڑ دیا اور سر کے اشارے سے ہمیں اندر آنے کو کہا۔ ہم صحن میں بچھی ایک پرانی دری پر بیٹھ گئے۔ مراد نے ایک لمبا سانس لیا اور بولا، "زبیر میرا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ کسی تنظیم میں نہیں تھا، نہ وہ ریاست کا کوئی بڑا افسر تھا۔ وہ تو بس ایک عام اسکول ٹیچر تھا۔ اس کا گناہ صرف یہ تھا کہ وہ بچوں کو قلم پکڑنا سکھاتا تھا، بندوق نہیں۔" وہ لمحہ بھر کو رکا، اس کی آواز میں لرزش آئی۔ "ایک رات کچھ لوگ آئے، وہ نقاب پوش تھے لیکن ان کی زبان بلوچی

تھی۔ وہ اسے زبردستی اٹھا کر لے گئے۔ ہم سمجھے شاید ریاست کے لوگ ہیں، ہم تھانے گئے، کیمپ گئے... لیکن دو دن بعد اس کی لاش پہاڑوں کے قریب سے ملی۔ اس کے سینے پر ایک پرچی لگی تھی جس پر لکھا تھا: 'یہ ریاست کا مخبر اور غدار تھا'۔" میں نے خاموشی سے اسے سنا۔ مراد نے میری طرف دیکھ کر غصے سے کہا، "ذیشان صاحب، غدار کون ہوتا ہے؟ وہ جو اپنے بچوں کو تعلیم دینا چاہے یا وہ جو تعلیم دینے والے کے سر میں گولی مار دے؟ میرے بھائی کو اپنوں نے مارا، صرف اس لیے کہ اس نے ان کی پرتشدد کارروائیوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔" میں نے پوچھا، "کیا آپ نے انصاف کے لیے کسی سے رابطہ کیا؟"مراد حقارت سے ہنسا، "کس سے انصاف مانگوں؟ ان تنظیموں سے جو خود کو بلوچوں کا خیر خواہ کہتی ہیں؟ یا اس ریاست سے جو ہمیں صرف اس وقت یاد کرتی ہے جب ہم لاش بن جاتے ہیں؟ یہاں تو ہم دو پاٹوں کے درمیان پس رہے ہیں۔

اگر ہم ان تنظیموں کا ساتھ نہ دیں تو 'غدار' قرار دے کر مار دیے جاتے ہیں، اور اگر ریاست پر بھروسہ کریں تو وہ ہمیں تحفظ نہیں دے پاتی۔" اس نے اپنی مٹھی بھینچی، "میرے بھائی کے چھوٹے چھوٹے بچے اب مجھ سے پوچھتے ہیں کہ 'بابا کہاں ہیں؟' میں انہیں کیا کہوں؟ کہ تمہارے بابا کو تمہارے ہی چچاؤں اور بھائیوں نے مار دیا؟"صحن کے کونے میں ایک بوڑھی ماں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی، اس کی آنکھیں خالی تھیں، جیسے وہ کسی اور دنیا میں چلی گئی ہو۔ مراد نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا، "وہ دیکھیں میری ماں کو... اسے اب نہ ریاست سے گلہ ہے نہ کسی تنظیم سے۔ وہ بس اس انتظار میں ہے کہ کب اسے بھی موت آئے اور وہ اپنے بیٹے سے جا ملے۔" شاہ میر نے مراد کو حوصلہ دیتے ہوئے اسکے ہاتھ کو تھاما۔ مراد نے میری طرف دیکھ کر کہا، "ذیشان بھائی! آپ اپنے مقدمے میں یہ ضرور لکھنا کہ بلوچستان کی مٹی صرف ریاست سے نہیں، بلکہ ان 'اپنے' شکاریوں سے بھی لہو لہو ہے جو آزادی کے نام پر ہماری نسلیں تباہ کر رہے ہیں۔

یہاں صرف ریاست ہی لاپتہ نہیں کرتی، یہاں یہ شدت پسند بھی ہمارے بھائیوں کو اٹھا کر مار دیتے ہیں اور الزام دوسروں پر لگا دیتے ہیں۔ ہم تو دونوں طرف سے پس رہے ہیں۔" میں نے نوٹ بک بند کی اور اٹھتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "مراد بھائی، میں وعدہ کرتا ہوں کہ زبیر کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ میں لکھوں گا کہ
کیسے۔'حقوق' کے نام پر اپنے ہی بھائیوں کا گلا کاٹا جا رہا ہے۔" ہم جب باہر نکلے تو مراد ہمیں دروازے تک چھوڑنے آیا۔ اس کی آنکھوں میں اب شک نہیں، ایک التجا تھی کہ کاش کوئی اس کا سچ بھی سن لے۔

تیسرا باب۔۔۔۔۔۔ قانون کے رکھوالے

شاہ میر نے چلتے ہوئے مجھ سے پوچھا، "اب کہاں جانا ہے ذیشان صاحب؟"میں نے دور نظر آتی ایک سرکاری عمارت کی طرف اشارہ کیا، "اب مجھے اس سسٹم کے کسی بڑے افسر سے ملنا ہے۔ مجھے پوچھنا ہے کہ جب مراد کے بھائی کو مارا جا رہا تھا اور کرامت کی ماں کی چیخیں نکل رہی تھیں، تو ریاست کہاں سو رہی تھی؟" میں نے گھڑی دیکھی، ڈیڑھ بج رہا تھا۔میں نے شاہ میر کی طرف دیکھا اور کہا، "شاہ میر، پیٹ خالی ہو تو دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ چلو، پہلے کہیں بیٹھ کر کچھ کھاتے ہیں، پھر ہم دونوں کوئٹہ کے ایک پرانے اور مشہور ہوٹل میں گئے جہاں سجی اور روش کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم ایک کونے والے میز پر بیٹھ گئے۔ شور شرابے کے باوجود ہمارے درمیان ایک بوجھل خاموشی تھی۔ ہم نے کھانا منگوایا، لیکن نوالہ حلق سے نیچے اترنا مشکل ہو رہا تھا۔ نسرین کا انتظار، کرامت کی ماں کی سسکیاں اور مراد کا غصہ میرے سامنے کسی فلم کی طرح چل رہے تھے۔میں نے چائے کا گھونٹ بھرا اور شاہ میر سے پوچھا، "شاہ میر، اب مجھے کسی ایسے شخص سے ملنا ہے جو ریاست کی طرف سے جواب دے سکے۔ کیا تمہارا کوئی واقف ہے؟" شاہ میر نے نفی میں سر ہلایا۔ "ذیشان بھائی، ان بڑے افسروں تک میری رسائی ناممکن ہے۔ان کے لیے میں ایک مشکوک بلوچ سے زیادہ کچھ نہیں ہوں لیکن تم تو لاہور کے بڑے اخبار سے ہو، اگر تم اپنے ایڈیٹر صاحب کو فون کرو تو شاید وہ کسی سے تمہاری ملاقات کروا دیں۔" میں نے میز پر پڑا اپنا "پریس کارڈ" اٹھایا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا، "نہیں شاہ میر! ایڈیٹر صاحب کے ایک فون سے میرے لیے دروازے تو کھل جائیں گے، مگر ان کی زبان نہیں کھلے گی۔ سفارش سے ملنے والا جواب ہمیشہ بناوٹی ہوتا ہے۔ میرے اندر ان ماؤں کے دکھوں کی جو آگ لگی ہے، میں اسی کی تپش لے کر ان کے پاس جاؤں گا۔ میں سفارش کے ذریعے نہیں، اپنے سوالوں کے زور پر اندر داخل ہوں گا۔"

شاہ میر نے حیرت سے دیکھا، شاہ میر بولا "ذیشان بھائی، اسطرح اپکا وہاں پہنچنا اتنا آسان نہیں، وہ بڑے لوگ ہیں۔" شاہ میر، سچ بولنے والے کے لیے کوئی بھی دروازہ ہمیشہ کے لیے بند نہیں رہتا،" میں نے عزم سے کہا۔میں سیدھا ڈی آئی جی (DIG) کے دفتر جاؤں گا۔ وہ مجھے نہیں جانتے، لیکن میرا 'صحافتی کارڈ' اور میرے سوالات انہیں مجبور کریں گے کہ وہ مجھ سے ملیں۔" شاہ میر نے حیرت اور ستائش بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں بولا، "ذیشان صاحب، یہاں کوئٹہ میں یہ ہمت بہت مہنگی پڑتی ہے۔""قیمت کی فکر نہ کرو شاہ میر، چلو!" میں نے جواب دیا اور میز پر رکھے کھانے کی آخری پلیٹ ایک طرف سرکائی۔ کھانا ختم ہو چکا تھا مگر باتوں کی کڑواہٹ ابھی باقی تھی۔

میں نے اپنی جیب سے بٹوا (Wallet) نکالا، کھانے کا بل میز پر رکھا اور کرسی پیچھے گھسیٹ کر کھڑا ہو گیا۔ شاہ میر بھی اپنی چادر درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم نے ہوٹل کے بیرے کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور باہر کی طرف چل پڑے۔ ہوٹل سے باہر سڑک پر ٹریفک کا شور اور ڈھول عروج پر تھی میں نے ہاتھ کے اشارے سے ایک خالی رکشہ روکا۔ شاہ میر میرے ساتھ بیٹھ گیا اور ہم نے ڈرائیور کو ڈی آئی جی (DIG) آفس چلنے کا کہا۔

رکشہ کوئٹہ کی تنگ اور مصروف گلیوں سے گزرتا ہوا جب کینٹ کے قریب پہنچا تو سکیورٹی کے حصار نمایاں ہونے لگے۔ ڈی آئی جی دفتر کے باہر خاردار تاریں اور ریت کی بوریاں لگی تھیں، جہاں کلاشنکوف تھامے پہرے دار ہر آنے جانے والے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ رکشہ رکتے ہی میں نیچے اترا۔ جیسے ہی میں مین گیٹ کے قریب پہنچا، ایک سنتری نے بندوق تان کر میرا راستہ روکا۔

"کدھر؟" اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ میں نے بلا خوف و خطر اپنا کارڈ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور نہایت رعب دار آواز میں کہا، "روزنامہ حرفِ حق، لاہور سے آیا ہوں۔ مجھے ڈی آئی جی صاحب سے ایک بہت اہم کیس پر ان کا موقف لینا ہے۔" "صاحب مصروف ہیں، کل آنا۔" سپاہی نے روایتی سپاہیانہ انداز میں جواب دیا۔ میں ایک انچ پیچھے نہیں ہٹا، بلکہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا، "دیکھو بھائی، میں پنجاب سے یہاں صرف 'کل' سننے نہیں آیا۔ تمہارے صاحب کے پاس دو راستے ہیں؛ یا تو وہ ابھی مجھے اپنا موقف دے دیں، یا پھر کل میرے اخبار کی شہ سرخی (Headline) میں یہ لکھا ہو کہ 'بلوچستان پولیس حقائق چھپانے کے لیے میڈیا سے بھاگ رہی ہے'۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم یہ پیغام اندر کیسے پہنچاتے ہو۔" سپاہی میری خود اعتمادی دیکھ کر تھوڑا ہچکچایا۔ اس نے میرا کارڈ لیا اور اندر ایک کمرے کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ کر بولا، "اندر ویٹنگ روم میں بیٹھیں۔ ڈی آئی جی صاحب ایک اہم میٹنگ میں ہیں، فارغ ہوں گے تو بلائیں گے۔" میں اندر چلا گیا اور ایک پرانی سی کرسی پر بیٹھ گیا۔

دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک مجھے چڑا رہی تھی۔ ایک گھنٹہ گزر گیا، مگر بلاوا نہ آیا۔ اس انتظار نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے دل میں سوچا، "ایک صحافی جس کے پاس 'حرفِ حق' جیسا کارڈ ہے، اسے ملنے کے لیے ایک گھنٹہ باہر بٹھا دیا گیا ہے۔ اگر کوئی عام بلوچ، کوئی غریب ماں یا کوئی بے سہارا باپ یہاں اپنے پیاروں کا انصاف مانگنے آتا ہو گا، تو اس کا کیا حال ہوتا ہوگا؟ اس نظام کے بند دروازے کیا کبھی ان کے لیے کھلتے بھی ہوں گے؟" میرا غصہ اور بے چینی بڑھ رہی تھی کہ اچانک وہی سپاہی نمودار ہوا اور بولا، "آئیں، صاحب بلا رہے ہیں۔" میں نے شاہ میر کو، جو باہر برآمدے میں کھڑا تھا، وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور گہرے سانس لیتے ہوئے ڈی آئی جی کے کمرے میں داخل ہوا۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے میرا استقبال کیا، مگر میز کے پیچھے بیٹھی شخصیت کی نظریں آگ برسا رہی تھیں۔ ڈی آئی جی صاحب — جن کی نیم پلیٹ پر 'جیلان لغاری' لکھا تھا — نے میرا کارڈ میز پر پٹخا اور کرسی پر پیچھے ٹیک لگا کر بولے، "تو آپ وہ صاحب ہیں جو میرے سنتری کو دھمکا کر اندر آئے ہیں؟ آپ کو اندازہ ہے کہ یہ کوئٹہ ہے، لاہور کا لکشمی

چوک نہیں؟" میں نے کوئی جھجک دکھائے بغیر ان کے سامنے والی کرسی کھینچی اور بیٹھتے ہوئے کہا، "لغاری صاحب! دھمکی وہ دیتے ہیں جن کے پاس سچائی نہ ہو۔ میں تو آپ کو موقع دینے آیا ہوں کہ ان ماؤں کے سوالوں کا جواب دیں جو کیمپوں میں بیٹھی آپ کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ میں کرامت کی لاش اور داؤد کے انتظار کا بوجھ اٹھا کر یہاں آیا ہوں۔ کیا ریاست کے پاس ان کے لیے کوئی جواب ہے؟"

جیلان لغاری نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی فائلیں ایک طرف سرکاتے ہوئے میز پر جھک گئے۔ ان کے چہرے کی سختی اب ایک سنجیدہ فکر میں بدل چکی تھی۔ "ذیشان صاحب!" انہوں نے دھیمی مگر کاٹ دار آواز میں کہا۔ "آپ کا جذبہ قابلِ ستائش ہے، لیکن آپ کی معلومات ادھوری ہیں۔ آپ نے ان ماؤں کے آنسو تو دیکھ لیے، مگر کیا کبھی ان پولیس والوں کے یتیم بچوں کی شکلیں دیکھیں جنہیں گلیوں میں نشانہ بنایا جاتا ہے؟

آپ نے صرف وہ لاشیں دیکھی ہیں جن کا سوگ منانے والے موجود ہیں۔ کبھی میرے ان جوانوں کی لاشیں دیکھی ہیں جنہیں چھٹی پر جاتے ہوئے بسوں سے اتار کر صرف 'پنجابی' ہونے کے جرم میں ذبح کر دیا جاتا ہے؟ ریاست کا جواب کوئی ایک جملہ نہیں، ایک پوری جنگ ہے جو ہم یہاں لڑ رہے ہیں۔"میں نے فوراً اپنی نوٹ بک کھولی اور قلم ان کی طرف تانتے ہوئے کہا، جنگ تو سرحدوں پر ہوتی ہے لغاری صاحب! اپنے ہی شہریوں کے خلاف جنگ کا کیا جواز ہے؟ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نسرین کا بھائی یا داؤد جیسے نوجوان اس ریاست کے لیے خطرہ تھے؟ اگر وہ مجرم تھے تو انہیں عدالتوں میں کیوں نہیں لایا گیا؟ وہ کیوں لاپتا ہیں؟"لغاری صاحب نے میز پر زور سے ہاتھ مارا، "کون سی عدالتیں ذیشان صاحب؟ یہاں گواہ ملتے ہیں آپ کو؟

ارشد لغاری نے میز پر پڑا ایک پیپر ویٹ گھمایا اور تلخ مسکراہٹ کے ساتھ مزید بولے، "ذیشان صاحب! آپ جسے 'لاپتہ' کہتے ہیں، ہم اسے 'روپوش' کہتے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ان میں سے کتنے ہی نوجوان اس وقت پہاڑوں پر بیٹھے انڈین اسلحے سے اپنے ہی بھائیوں کا خون بہا رہے ہیں؟ جب ہم کسی کو اٹھاتے ہیں تو ہمارے پاس اس کی دہشت گردی کے ثبوت ہوتے ہیں، مگر عدالت میں گواہ نہیں ملتے۔ کیوں؟ کیونکہ گواہ کو پتہ ہے کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اگلے دن اس کی لاش ملے گی یہاں کے لوگ سچ بولنے سے زیادہ مرنے سے ڈرتے ہیں۔ جب ہم کسی دہشت گرد کو پکڑتے ہیں تو اسے چھڑوانے کے لیے اسلام آباد سے لے کر کوئٹہ تک کے بڑے بڑے 'سرداروں' کے فون بجنا شروع ہو جاتے ہیں۔""آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے؟" میں نے اپنی آواز کو مزید سخت کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا پولیس اتنی بے بس ہے کہ سرداروں کے سامنے گھٹنے ٹیک دے؟"جیلان لغاری تلخ ہنسی ہنسے۔ "آپ 'سردار زارک خان' کا نام سننا چاہتے ہیں نا؟ تو سن لیں۔ زارک خان جیسے لوگ اس مٹی کے وہ ناسور ہیں جو ایک ہاتھ سے حکومت سے مراعات لیتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے سرحد پار بیٹھے اپنے آقاؤں کے ایجنڈے پر کام کرتے ہیں۔ کیا آپ کو پتہ

ہے کہ جسے آپ 'لاپتہ' کہتے ہیں، ان میں سے کتنے ہی نوجوان اس وقت زارک خان کے خفیہ تربیتی کیمپوں میں موجود ہیں؟"

"اگر آپ کو یہ سب معلوم ہے، تو آپ خاموش کیوں ہیں؟" میں نے چیلنج بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کیا ریاست اتنی کمزور ہے کہ ایک سردار کو لگام نہیں ڈال سکتی؟ یا پھر آپ لوگ خود اس کھیل کا حصہ ہیں؟"

کمرے میں ایک لمحے کے لیے ایسی خاموشی چھائی کہ اے سی کی گونج بھی بھاری لگنے لگی۔ لغاری صاحب کی آنکھوں میں غصے کی چمک ابھری، مگر انہوں نے خود پر قابو پایا۔ "بولنا آسان ہے ذیشان صاحب! لیکن جب آپ کی گاڑی کے نیچے بم پھٹتا ہے یا آپ کے سپاہیوں کی لاشیں ملتی ہیں، تب پتہ چلتا ہے کہ دشمن کتنا گہرا ہے۔ زارک خان صرف ایک انسان نہیں، ایک پورا نیٹ ورک ہے جسے بیرونی فنڈنگ ملتی ہے۔ ہم جب بھی اس کے خلاف حرکت کرتے ہیں، وہ 'انسانی حقوق' اور 'بلوچ حقوق' کا واویلا مچا کر آپ جیسے لکھاریوں کو اپنی ڈھال بنا لیتا ہے۔" میں نے کرسی پر پیچھے ٹیک لگائی اور ایک سرد مسکراہٹ کے ساتھ کہا، "تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ریاست بے بس ہے؟ آپ مان رہے ہیں کہ کوئٹہ کی سڑکوں پر قانون نہیں، بلکہ زارک خان کی مرضی چلتی ہے؟ لغاری صاحب، میرا اخبار 'حرفِ حق' یہی سچ لکھے گا کہ ریاست نے اپنے شہریوں کو سرداروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔"

جیلان لغاری نے اپنی کرسی تھوڑی آگے کی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے، "اگر آپ میں اتنی ہی ہمت ہے، تو جائیے زارک خان کے دربار میں۔ اس سے پوچھیے کہ وہ بیرونی پیسہ کہاں جاتا ہے؟ اس سے پوچھیں کہ لاپتہ نوجوانوں کی فہرست میں ان کے نام کیوں نہیں ہوتے جو اس کے کہنے پر ہتھیار اٹھاتے ہیں؟"

انہوں نے ایک دراز کھولی اور ایک دھندلی سی تصویر میری طرف اچھال دی۔ "یہ دیکھیں! یہ وہ نوجوان ہے جسے آپ 'لاپتہ' کی فہرست میں دکھا رہے تھے۔ یہ تصویر اس کی افغانستان کے ایک کیمپ میں ٹریننگ کے دوران لی گئی ہے۔ اب بتائیں، میں اسے ڈھونڈ کر اس کی ماں کو دے دوں یا اسے سرحد پر گولی مار دوں؟"

میرا ذہن چکرا گیا۔ سچ کی تہیں اس قدر الجھی ہوئی تھیں کہ اب یہ سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ مظلوم کون ہے اور ظالم کون۔

جیلان لغاری کی دی ہوئی تصویر میرے ہاتھ میں کانپ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ شاید میں غلط راستے پر ہوں، مگر پھر مجھے زر جان خالہ کی وہ ٹپکتی چھت اور کرامت کی ماں کا وہ خالی صحن یاد آ گیا۔ میں نے وہ تصویر میز پر واپس پٹخی اور کرسی پر ذرا آگے کو جھک گیا۔ لغاری صاحب! یہ ایک تصویر پورے بلوچستان کا سچ نہیں ہو سکتی،" میری آواز میں اب پہلے سے زیادہ کاٹ تھی۔ "آپ نے مجھے یہ تصویر تو دکھا دی، مگر کیا آپ کے پاس اس بات کا جواب ہے کہ ایک عام شہری کے لیے آپ کے دفتر کے دروازے کیوں بند ہیں؟ میں ایک صحافی ہو کر ایک گھنٹہ باہر دھول چاٹتا رہا، تو وہ مزدور، وہ بیوہ، وہ بوڑھا باپ جس کا بیٹا غائب ہے، اسے تو آپ کے سپاہی سیڑھیوں تک نہیں چڑھنے

دیتے۔ یہ کیسا نظام ہے جہاں انصاف کے لیے بھی سفارش یا 'سرخی' کی دھمکی چاہیے ہوتی ہے؟" جیلان لغاری نے کچھ کہنا چاہا، مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔ نہیں لغاری صاحب! آج آپ کو سننا ہوگا۔ آپ کہتے ہیں کہ کچھ لوگ افغانستان میں ہیں، مان لیا۔ مگر اس لودھراں کی ماں کے 'کرامت' کا کیا قصور تھا؟ وہ تو مزدوری کرنے آیا تھا، اسے آپ کی ناک کے نیچے سرعام گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ اس وقت آپ کی 'ریاستی رٹ' کہاں تھی؟ داؤد بلوچ، جو صرف اپنی ماں کے لیے دوائی لینے نکلا تھا، اس کا ریکارڈ آپ کے پاس کیوں نہیں؟ اگر وہ گناہ گار ہے تو اسے عدالت کیوں نہیں لاتے؟ کیا اس لیے کہ آپ کی عدالتیں اور تھانے صرف غریبوں کے لیے بنے ہیں؟" لغاری صاحب کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا، مگر ان کی خاموشی بتا رہی تھی کہ میرے سوالوں میں کہیں نہ کہیں سچ چھپا ہے۔ وہ بولے، "ذیشان صاحب، آپ جذبات کی زبان بول رہے ہیں، حقائق کی نہیں۔ ہم محدود وسائل میں اس آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

وسائل کم ہیں یا نیت؟ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "آپ کے وسائل تب کہاں جاتے ہیں جب کسی سردار کا پروٹوکول گزرتا ہے؟ جب زارک خان جیسے لوگ قانون کو پیروں تلے روندتے ہیں، تب تو آپ کی پولیس ان کے لیے راستہ بناتی ہے۔ آپ نے نظام کو اتنا پیچیدہ اور خوفناک بنا دیا ہے کہ ایک عام بلوچ اپنی فریاد لے کر آپ کے پاس آنے کے بجائے ان شدت پسندوں کی طرف دیکھتا ہے جو اسے فوری 'انصاف' کا جھانسہ دیتے ہیں۔ آپ کی بے حسی ہی ان تنظیموں کا ایندھن بن رہی ہے لغاری صاحب!"

جیلان لغاری نے کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور رک کر میری طرف دیکھا۔ "آپ کو لگتا ہے کہ میں یہاں خوشی سے بیٹھا ہوں؟ میں ہر روز اپنے جوانوں کی لاشیں اٹھاتا ہوں۔ جب کوئی دھماکہ ہوتا ہے تو سب سے پہلے ہم نشانہ بنتے ہیں۔ ہم اس چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہے ہیں جہاں ایک طرف ریاست کی خاموش پالیسیاں ہیں اور دوسری طرف عوام کا غصہ۔""تو پھر اس خاموشی کو توڑیں لغاری صاحب!" میں نے سنجیدگی سے کہا میں صرف ایک صحافی بن کر نہیں، ان تمام مظلوموں کا مقدمہ لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں نے نسرین سے، زرجان خالہ سے اور مراد بلوچ سے وعدہ کیا ہے کہ ان کی سسکیاں ایوانوں تک پہنچیں گی۔ میں ان کے دکھ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر یہاں بیٹھا ہوں۔ مجھے نہیں پتہ کہ آپ کی فائلیں کیا کہتی ہیں اور آپ کی مجبوریاں کیا ہیں، لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ آپ اس ریاست کا چہرہ ہیں۔انہیں مظلوموں کو یقین دلائیں کہ یہ ملک ان کا بھی ہے۔ جب تک آپ ان کی دہلیز تک نہیں جائیں گے، یہ فاصلے کم نہیں ہوں گے۔" جیلان لغاری کی نظریں جھک گئیں۔ میں نے اپنی نوٹ بک سنبھالتے ہوئے آخری بات کہی: میں سردار زارک خان بلوچ کے پاس بھی جاؤں گا، "میں ایک صحافی ہوں، میرا کام لکھنا ہے اور میں لکھوں گا۔ میں نے ان مظلوموں سے وعدہ کیا ہے کہ میں سچ کو دفن نہیں ہونے دوں گا۔ اب یہ آپ پر ہے کہ آپ تاریخ میں ایک بے

حس افسر کے طور پر یاد رکھے جانا چاہتے ہیں یا اس مسیحا کے طور پر جس نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا تھا۔ یاد رکھیے گا... تاریخ آپ سے بھی سوال کرے گی کہ جب بلوچستان جل رہا تھا، تو آپ نے صرف فائلوں کا پیٹ بھرا تھا یا کسی کے آنسو پونچھے تھے۔" میں امید کرتا ہوں کہ جب میں دوبارہ کوئٹہ آؤں گا، تو ان خیموں میں ماتم نہیں، انصاف کی بازگشت ہوگی۔" میں نے ایک رسمی سا سلام کیا اور پیچھے مڑے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل آیا۔ کوریڈور میں چلتے ہوئے میرے جوتوں کی آواز مجھے کسی بڑے عزم کی چاپ لگ رہی تھی۔ باہر نکلا تو شاہ میر سائے میں کھڑا بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا ذیشان بھائی! کیا ہوا؟ کچھ بات بنی؟" اس نے لپک کر پوچھا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور آسمان کی طرف دیکھا جہاں بادل چھا رہے تھے۔ "شاہ میر! میں نے بیج بو دیا ہے، اب دیکھتے ہیں کہ اس بنجر زمین پر انصاف اُگتا ہے یا نہیں۔

شاہ میر نے حیرانگی سے پوچھا اگے کا کیا ارادہ ہے؟

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور سنجیدگی سے کہا، "شاہ میر! وردی والوں کا موقف اور ان کی مجبوری تو میں نے سن لی۔ چلو اب ان 'سیاست دانوں' سے پوچھتے ہیں جو اسمبلیوں میں بیٹھ کر ان ماؤں کی 'نمائندگی' کا دعویٰ کرتے ہیں۔ دیکھنا تو ہے کہ وہ عوام کے دکھ بانٹ رہے ہیں یا صرف اپنی کرسی بچا رہے ہیں۔ شاہ میر نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا، "لیکن یہ کام کل کریں گے۔ آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ ابھی تھوڑا آرام بھی کریں گے اور ذہنی طور پر خود کو بھی تیار کرنا ہے۔ دن بھر میں جو کچھ دیکھا اور سنا ہے، اس بوجھ کے ساتھ کسی نئے محاذ پر جانا درست نہیں۔ ابھی ہمیں ان تمام معلومات اور رپورٹوں کو ایک ترتیب دینی ہے۔" ہم ہوٹل پہنچے تو کمرے کی دیواریں بھی جیسے ان سوالوں کی گونج سے بھری ہوئی تھیں۔ میں نے اپنا بیگ میز پر رکھا اور شاہ میر سے کہا، "شاہ میر، یہ جو رپورٹیں اور انٹرویوز میں نے اکٹھے کیے ہیں، ان کا فی الحال ان سیاست دانوں سے کوئی لینا دینا نہیں۔ یہ میرا 'قلمی اثاثہ' ہے جسے میں نے اس مٹی کے لیے ترتیب دینا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے خود ان سب حقائق کا نچوڑ نکالوں۔"

میں نے کرسی کھینچی اور لیپ ٹاپ آن کر لیا۔ شاہ میر خاموشی سے صوفے پر بیٹھ کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے ایک نئی فائل کھولی اور عنوان دیا:

بلوچستان: تین زاویے، ایک المیہ۔

پہلا ورق: ریاست —— محافظ یا دیوار؟

ریاست کا دعویٰ ہے کہ وہ اس بنجر زمین پر امن کی فصل بونا چاہتی ہے، وہ کہتی ہے کہ اس کے جوانوں کا لہو اس مٹی کو سینچ رہا ہے تاکہ تخریب کاری کے خاردار تار کاٹے جا سکیں، اور یہ سچ بھی ہے۔ سرحد پار سے آنے والی سازشوں کا راستہ روکنے کے لیے اس نے اپنے سینے تان رکھے ہیں۔ سکیورٹی فورسز نے جس طرح دہشت گردوں کے نیٹ ورکس

کو توڑا ہے، وہ قابلِ تحسین ہے۔ مگر سچ کا دوسرا رخ وہ "خاموشی" ہے جو ان اونچی دیواروں کے پیچھے بستی ہے۔ جب ایک عام شہری انصاف کے لیے ان دروازوں پر دستک دیتا ہے تو اسے وردی کا رعب اور قانون کی پیچیدگیاں ملتی ہیں۔ ریاست کی سب سے بڑی کمزوری اس کا وہ "اعتبار" ہے جو ان ماؤں کی سسکیوں میں کھو گیا ہے جن کے بیٹے برسوں سے لاپتہ ہیں۔ اگر ریاست مجرم کو عدالت نہیں لاتی، تو وہ انجانے میں اس نفرت کو ہوا دیتی ہے جسے دشمن اپنے حق میں استعمال کرتا ہے۔ ریاست نے جن سرداروں کو اپنی ڈھال بنایا، آج وہی سردار اس کے گلے کا طوق بن چکے ہیں۔ ریاست نے ہمیشہ چند مخصوص سرداروں کو اپنے مفادات کے لیے نوازا اور بدلے میں انہیں عوام پر ظلم کی کھلی چھٹی دے دی۔ یہ ریاست کی وہ سیاسی ناکامی ہے جس نے عام بلوچ کو "سیاسی متبادل" سے محروم کر دیا اور اسے باغی گروہوں کے ہتھے چڑھا دیا۔ ریاست گوادر اور سی پیک جیسے منصوبوں کو بلوچستان کی تقدیر بدلنے والا قرار دیتی ہے، مگر مقامی بلوچ کے لیے یہ ترقی اس وقت تک بے معنی ہے جب تک اسے اپنے گھر میں پینے کا صاف پانی اور اپنے بچوں کے لیے روزگار میسر نہ ہو۔ ترقی کے ان دعووں اور زمینی پسماندگی کے درمیان جو خلیج ہے، وہ ریاست کی پالیسی سازی پر ایک بڑا سوالیہ نشان ہے

دوسرا ورق: شدت پسند — مسیحا یا جلاد؟

وہ جو پہاڑوں پر بیٹھے "آزادی" کے گیت گاتے ہیں، ان کے ہاتھوں پر اپنوں ہی کا خون ہے۔ یہ کیسی آزادی ہے جو کسی غریب مزدور کو اس کی زبان کی بنیاد پر بس سے اتار کر ذبح کرنے سے ملتی ہے؟ یہ کیسا انقلاب ہے جو مراد جیسے بلوچوں کے بھائیوں کو صرف اس لیے 'مخبر' قرار دے کر مار دیتا ہے کیونکہ وہ بندوق کے بجائے قلم کی بات کرتے ہیں؟ یہ بیرونی اشاروں پر ناچنے والے وہ شکاری ہیں جو مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر اپنے ہی بھائیوں کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ اسکولوں کو اڑانا، ترقیاتی کاموں میں رکاوٹ ڈالنا اور عام بلوچ کو 'مخبری' کے شک میں ذبح کر دینا کسی صورت آزادی کی جنگ نہیں یہ تنظیمیں اپنی بقا کے لیے 'حقوق' کے نام پر عام بلوچ نوجوانوں کو ایندھن کے طور پر استعمال کر رہی ہیں اور پورے صوبے کو دہائیوں پیچھے دھکیل رہی ہیں۔

تیسرا ورق: عام بلوچ — چکی کے دو پاٹوں میں۔۔۔۔

سب سے بڑا سچ وہ 'عام بلوچ' ہے جس کی آواز ان دونوں شور مچانے والے فریقوں کے درمیان دب کر رہ گئی ہے۔ ایک طرف ریاست کا سخت پہرہ ہے اور دوسری طرف بندوق برداروں کا خوف۔ وہ بیچارہ تو صرف دو وقت کی روٹی اور اپنے بچوں کے لیے سکون چاہتا ہے۔ اسے نہ اسلام آباد کے اقتدار سے غرض ہے نہ پہاڑوں کے نعروں سے۔ وہ تو نسرین کی طرح اپنے بھائی کا منتظر ہے یا زر جان خالہ کی طرح اس ٹپکتی چھت کے نیچے انصاف کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ اس مٹی کا اصل وارث وہی ہے، مگر افسوس کہ اس کی زمین پر فیصلے وہ کر رہے ہیں جن کے اپنے بچے ملک سے باہر محفوظ مقامات پر پڑھ رہے ہیں۔ عام بلوچ جو نہ ریاست کے دشمن ہیں اور نہ ہی دہشت گردوں کے حامی، بلکہ یہ وہ

مظلوم ہیں جن کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ اس مٹی پر پیدا ہوئے۔ ان کا مطالبہ صرف 'انصاف' ہے، جو انہیں نہ تو سکیورٹی کے حصاروں میں مل رہا ہے اور نہ ہی ان سرداروں کے درباروں میں جو ان کے نام پر سیاست کر رہے ہیں۔
شاہ میر نے جب یہ پڑھا تو اسے کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "ذیشان بھائی، تم نے ہمارے دلوں کا نوحہ لکھ دیا ہے۔ یہ رپورٹ نہیں، یہ تو اس مٹی کی چیخیں ہیں۔" مگر یہ چیخیں ان بہرے کانوں تک پہنچیں گی کیسے؟"
میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور شاہ میر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، "پہنچیں گی شاہ میر، ضرور پہنچیں گی۔ اب میں اس علاقے کے منتخب نمائندے، مرتضیٰ مزارانی سے ملوں گا۔"

شاہ میر کے چہرے پر ایک خوفناک مسکراہٹ آئی، "مرتضیٰ مزارانی؟ ذیشان بھائی، وہ تو سردار زارک خان کا دستِ راست ہے۔ اس کے بنگلے کے باہر تو پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ وہ تم جیسے ایک صحافی سے کیوں ملے گا؟ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔" "ممکن کرنا میرا کام ہے شاہ میر،" میں نے اعتماد سے کہا۔ "طاقتور کو صرف ایک چیز کا خوف ہوتا ہے، اور وہ ہے اس کا اپنا گندا چہرہ جو اگر دنیا کے سامنے آ جائے تو اس کی سیاست کی بساط پلٹ جاتی ہے۔ دیکھنا وہ ملتا کیسے نہیں!" میں نے شاہ میر کے سامنے اپنا فون اٹھایا اور مرتضیٰ مزارانی کے پرسنل سیکریٹری کا نمبر ڈائل کرنے کے بجائے ایک تیکھا میسج ٹائپ کرنا شروع کیا۔ میں نے لکھا: "جناب مرتضیٰ مزارانی صاحب! میں 'روزنامہ حرفِ حق' سے ذیشان حیدر ہوں۔ میرے پاس اس وقت ایک ایسی رپورٹ اور کچھ ایسی خفیہ تصاویر موجود ہیں جو ریاست، شدت پسند تنظیموں اور آپ کے 'سردار' کے درمیان ہونے والے اس تکون کا کچا چٹھا کھولتی ہیں۔ یہ رپورٹ کل صبح انٹرنیشنل میڈیا اور میرے اخبار کی شہ سرخی بننے جا رہی ہے۔ پبلش کرنے سے پہلے میں ایک ذمہ دار صحافی کے طور پر آپ کا موقف شامل کرنا چاہتا ہوں تاکہ کل کو آپ یہ نہ کہیں کہ آپ کو صفائی کا موقع نہیں ملا۔ فیصلہ آپ کا ہے، سچ کے ساتھ کھڑا ہونا ہے یا سچ کے ہاتھوں مٹنا ہے۔"
"ابھی دیکھو، اس کا جواب کیسے آتا ہے،" میں نے مسکرا کر کہا۔ "آؤ، اب نیچے چلتے ہیں۔ بھوک سے دم نکل رہا ہے، کچھ کھاتے ہیں پھر کل کی تیاری کریں گے۔"
ہم ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں آئے اور ایک کونے والی میز سنبھال لی۔ میں نے لورالائی کی مشہور 'روش' منگوائی۔ ابھی پہلا نوالہ ہی توڑا تھا کہ میری جیب میں موبائل تھرتھرایا۔ میں نے سکرین دیکھی، شاہ میر بھی نوالہ روک کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ سیکریٹری کا میسج تھا: "ذیشان صاحب،
مرتضیٰ مزارانی صاحب آپ کے میسج کے لہجے سے کافی برہم ہیں، لیکن وہ نہیں چاہتے کہ کوئی ادھورا سچ منظرِ عام پر آئے۔ وہ کل بہت مصروف تھے، مگر آپ کی 'رپورٹ' کی حساسیت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کل صبح ٹھیک 10 بجے اپنے بنگلے پر آپ کو بلایا ہے۔ وقت کی پابندی کیجیے گا۔" میں نے موبائل شاہ میر کی طرف کر دیا اور اطمینان سے اپنا

نوالہ چبانے لگا۔ شاہ میر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "ذیشان بھائی! آپ تو کمال کے کھلاڑی نکلے۔ جس شخص سے ملنے کے لیے لوگ مہینوں لائن میں لگتے ہیں، اس نے خود آپ کو بلا لیا؟"میں نے چائے کا گھونٹ بھرا اور کہا، "شاہ میر، یہ ذیشان کا کارڈ نہیں، یہ سچ کا خوف ہے۔ کل صبح 10 بجے ہم اس کے محل میں ہوں گے۔ کل کی صبح صرف انٹرویو نہیں، ایک فیصلہ ہو گی۔" ہم نے سکون سے کھانا ختم کیا اور واپس کمرے میں آ گئے۔ میں نے بستر پر لیٹتے ہوئے شاہ میر سے کہا، "آج جی بھر کے سو لو شاہ میر، کیونکہ کل جب ہم اس بنگلے سے باہر نکلیں گے، تو شاید کوئٹہ کی ہوا ہمارے لیے اتنی دوستانہ نہ رہے۔"

اگلی صبح جب میری آنکھ کھلی تو کوئٹہ کی ٹھنڈی ہوا کھڑکی کے پردوں سے چھن کر کمرے میں آ رہی تھی۔ شاہ میر پہلے ہی بیدار ہو چکا تھا اور جائے نماز پر بیٹھا شاید اپنے وطن کی خیر مانگ رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی، آٹھ بج رہے تھے۔ "شاہ میر، ناشتہ منگواؤ، آج ہمیں خالی پیٹ جنگ نہیں لڑنی،" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ہم نے ہوٹل کے کمرے میں ہی ناشتہ کیا۔ چائے کی بھاپ اڑ رہی تھی، مگر ہم دونوں ہی خاموش تھے۔
"ذیشان بھائی،" شاہ میر نے گلاس رکھتے ہوئے پوچھا، "کیا میں تمہارے ساتھ اندر جاؤں گا؟ مرتضیٰ مزارانی مجھے دیکھ کر شاید اچھا محسوس نہ کرے۔"
میں نے شاہ میر کی آنکھوں میں دیکھا۔ "شاہ میر، تم نے سردار کے کارندوں کا قہر دیکھا ہے، اب اس کے سیاسی مہرے کا غرور بھی دیکھو۔ تم میرے ساتھ جاؤ گے، مگر تم 'شاہ میر بلوچ' بن کر نہیں بلکہ میرے 'اسسٹنٹ' بن کر جاؤ گے۔ تم نے وہاں صرف سننا اور مشاہدہ کرنا ہے۔ تمہاری موجودگی میرا حوصلہ بھی ہو گی اور اس مٹی کی گواہی بھی۔" شاہ میر نے اثبات میں سر ہلایا، نو بجے کے قریب ہم نے ہوٹل سے نکل کر ایک ٹیکسی کروائی۔ ہوٹل سے مرتضیٰ مزارانی کا بنگلہ تقریباً بیس منٹ کی مسافت پر تھا، جو کوئٹہ کے سب سے مہنگے اور محفوظ علاقے میں واقع تھا۔

رستے بھر میں ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر کے مناظر بدلتے رہے۔ جہاں بازار تھے، وہاں ہجوم تھا، مگر جیسے ہی ہم بنگلوں والے علاقے میں داخل ہوئے، ایک پراسرار سی خاموشی چھا گئی۔ شاہ میر نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے دبی آواز میں کہا، "ذیشان بھائی، یہ علاقہ عام بلوچوں کے لیے 'ممنوعہ بستی' سے کم نہیں۔ یہاں صرف وہی آتے ہیں جن کی گردنیں سردار کے آگے جھکی ہوں۔ آج ایک ایسی گردن آئے گی شاہ میر، جو صرف سچ کے آگے جھکنا جانتی ہے،" میں نے پختہ لہجے میں جواب دیا۔ ٹیکسی ایک بلند و بالا لوہے کے گیٹ کے سامنے رکی۔ گیٹ کے دونوں اطراف جدید اسلحے سے لیس نجی گارڈز کھڑے تھے، جن کی واسکٹوں پر سردار کے قبیلے کا نشان بنا ہوا تھا۔ میں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور نیچے اترا۔ شاہ میر نے اپنی چادر درست کی اور میرے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنی جیکٹ درست کی، نوٹ

بک ہاتھ میں پکڑی اور گیٹ کی طرف قدم بڑھائے۔ "شاہ میر، یاد رکھنا، اندر جو کچھ بھی ہو، تم نے صرف میری آنکھوں کے اشارے پر عمل کرنا ہے۔" شاہ میر نے خاموشی سے سر جھکایا۔ سکیورٹی گارڈ نے ہمیں روک کر تلاشی لی اور پھر وائرلیس پر اندر پیغام بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد بھاری گیٹ ایک خوفناک چرچراہٹ کے ساتھ کھلا، جیسے کسی شکاری کا جبڑا کھلا ہو۔ ہمارا سامنا اب مرتضیٰ مزارانی کے اس عالیشان دربار سے تھا، جہاں سے لاکھوں لوگوں کی قسمت کے فیصلے تو ہوتے تھے، مگر جہاں انصاف کی رسائی ہمیشہ سے ناممکن رہی تھی۔

بنگلے کے اندر قدم رکھتے ہی فضا بدل گئی۔ باہر کی گرد آلود سڑکوں کے برعکس یہاں ریشمی قالین بچھے تھے اور ہوا مہنگے پرفیوم کی خوشبو سے لدی ہوئی تھی۔ شاہ میر میرے پیچھے اتنی خاموشی سے چل رہا تھا جیسے وہ اپنا وجود چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی نظریں نیچی تھیں، مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ ہمیں ایک وسیع راہداری سے گزار کر ایک بھاری ساگوان کے دروازے کے سامنے لایا گیا۔ گارڈ نے دروازہ کھولا اور ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ کمرہ کسی لائبریری سے زیادہ 'دربار' لگ رہا تھا۔ دیواروں پر ہرن کے سینگ اور قدیم تلواریں لگی تھیں، جو شاہانہ رعب کا پتہ دیتی تھیں۔ سامنے ایک لمبی میز کے پیچھے مرتضیٰ مزارانی بیٹھا تھا۔ اس نے سفید کلف لگی واسکٹ پہنی تھی اور ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ کسی منجھے ہوئے اداکار کی طرح اپنی کرسی سے اٹھا اور ایک چوڑی، مصنوعی مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجا لی۔ آیئے، آیئے ذیشان صاحب! خوش آمدید،" اس نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے نہایت لجاجت سے کہا۔ "لاہور سے ہمارے مہمان آئے ہیں، ہمیں تو بڑی خوشی ہوئی۔ پھر اس کی نظر شاہ میر پر پڑی۔ "اور یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟" یہ میرے اسسٹنٹ ہیں، شاہ میر بلوچ،" میں نے اعتماد سے جواب دیا "امید ہے آپ کو ان کی موجودگی سے کوئی اعتراض نہیں ہوگا، کیونکہ یہ اس مٹی کے بیٹوں کے جذبات کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔" اس نے لمحے بھر کے لیے شاہ میر کو دیکھا اور پھر ہمیں سامنے پڑے نرم و ملائم چمڑے کے صوفوں پر بٹھا کر خود ایک فاتحانہ انداز میں سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے فوراً ایک گھنٹی بجائی اور ایک ملازم سفید وردی پہنے، سر جھکائے حاضر ہو گیا۔

"صاحب کے لیے تازہ جوس، بہترین کافی اور خشک میوہ جات لاؤ۔" اس نے حکم دیا اور پھر میری طرف مڑ کر آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولا، "سنا ہے آپ لوگ لاہور میں بڑی بھاگ دوڑ کرتے ہیں، یہاں کوئٹہ کی مہمان نوازی کا بھی ذائقہ چکھیں۔" ملازم تھوڑی دیر میں چاندی کی ٹرے لیے واپس آیا۔ میز پر پڑے ہوئے کرسٹل کے جگ اور چمکتے ہوئے شیشے کے گلاسوں میں شفاف پانی دیکھ کر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ میرے ذہن میں ایک دم زر جان خالہ کا وہ کچا صحن اور وہ مٹی کا پرانا گھڑا گھوم گیا، جس میں پانی نہیں، صرف حسرتیں بھری تھیں۔ میں نے دل میں سوچا، "یہاں

ایک گلاس پانی کی قیمت ان فانوسوں کی چمک سے زیادہ ہے، اور وہاں ایک ماں کے پاس پینے کو صاف پانی تک نہیں۔ ان کی عیاشیوں کے محلات معصوموں کی سسکیوں پر کھڑے ہیں۔" مرتضیٰ مزارانی نے ایک کاجو منہ میں ڈالا اور نہایت اپنائیت سے بولا، "ہاں تو ذیشان حیدر صاحب! آپ نے رات میسج میں بڑی خطرناک باتیں لکھی تھیں۔ سنیے، میں سیاست دان ہوں، ہمیں ڈرانے کے لیے روز ایسی رپورٹیں آتی ہیں۔ چھوڑیے ان باتوں کو، آپ یہاں سیر سپاٹے کے لیے آئے ہیں، ہم آپ کو زیارت گھمائیں گے، آپ کی خدمت کریں گے۔ بتایئے، لاہور کے اخبار کو ہم سے کیا چاہیے؟" اس کی مکرانہ چال صاف ظاہر تھی۔ وہ مجھے اپنی "سیاسی مہمان نوازی" کے جال میں پھنسانا چاہتا تھا۔ میں نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا اور سامنے پڑا جوس کا گلاس چھوئے بغیر اپنی نوٹ بک میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "مرتضیٰ صاحب! میں یہاں زیارت کی ٹھنڈی ہوائیں لینے یا آپ کے خشک میوے کھانے نہیں آیا،"

میرا لہجہ اب کسی تیز دھار خنجر کی طرح تھا۔ "میں ان خشک آنکھوں کا سوال لے کر آیا ہوں جو اب رونا بھی بھول چکی ہیں۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ جب نسرین کا بھائی اٹھایا گیا تو آپ کی زبان کیوں خاموش تھی؟ اور جب لودھراں کا مزدور مارا گیا تو آپ نے اسے 'آزادی کی جنگ' کا حصہ کہہ کر کیوں ٹالا؟

مرتضیٰ مزارانی نے تیکھی نظروں سے شاہ میر کو دیکھا، پھر ایک دم اس کے چہرے پر وہی مکارانہ مسکراہٹ واپس آ گئی۔ اس نے اطمینان سے سگار کا ایک لمبا کش لیا اور دھواں فضا میں اچھالتے ہوئے بڑے دھیمے لہجے میں بولا:

"ذیشان صاحب! آپ کے قلم میں بڑی کاٹ ہے، ماشاء اللہ۔ مگر آپ شاید ابھی 'سیاسی نزاکتوں' سے ناواقف ہیں۔ آپ جیسے لوگ کتابی سچائیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں، لیکن ہم یہاں زمین پر اس آگ کو سنبھال رہے ہیں۔ کبھی کبھی بڑی تباہی سے بچنے کے لیے کچھ چھوٹی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ آپ جسے 'خاموشی' کہہ رہے ہیں، وہ دراصل ہماری وہ 'سیاست' ہے جس کے ذریعے ہم اس صوبے کو مکمل بکھرنے سے بچائے ہوئے ہیں۔ آپ ان پیچیدہ چالوں کو نہیں سمجھ سکتے جو ہم جیسے لوگوں کو چلنی پڑتی ہیں۔"

وہ رکا، میز پر جھکا اور اپنی آواز کو سرگوشی کی حد تک نیچا کر لیا: "دیکھیں ذیشان صاحب! آپ ایک ذہین صحافی ہیں، اور ذہین لوگ ضدی نہیں ہوتے۔ آپ کی یہ رپورٹ... یہ سچ... اگر غلط ہاتھوں میں لگ گیا تو یہاں مزید خون بہے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ سچ ہمارے درمیان ہی رہے۔ آپ اپنی محنت کی قیمت بتائیں۔ یہ رپورٹ ہمیں دے دیں، ہم آپ کو اتنا دیں گے کہ آپ کی سات نسلیں لاہور میں بیٹھ کر کھائیں گی۔ ورنہ..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ورنہ کیا؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔ "ورنہ میں بھی 'لاپتہ' افراد کی فہرست میں شامل ہو جاؤں گا؟ مرتضیٰ صاحب، آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ 'حرفِ حق' کے قلم کو خریدنے والی کرنسی ابھی ایجاد نہیں ہوئی۔ میں یہاں سودا کرنے نہیں، آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ آپ کا وقت ختم ہو رہا ہے۔" مرتضیٰ مزارانی کے چہرے سے مصنوعی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی، جیسے کسی نے نقاب اتار دیا ہو۔ اس نے ماتھے پر ابھرنے والے پسینے کو پونچھا اور کرسی پر پیچھے

ٹیک لگا کر بولا، "ذیشان صاحب! آپ شاید راستہ بھٹک گئے ہیں۔ یہ سیاست ہے، یہاں الفاظ تول کر بولے جاتے ہیں۔

"الفاظ تب تولے جاتے ہیں جب ضمیر زندہ ہو، مرتضیٰ صاحب!" میں نے کرسی پر آگے جھکتے ہوئے کہا۔ "آپ یہاں اسمبلی میں بیٹھ کر 'بلوچ حقوق' کی گردان کرتے ہیں، اور رات کی تاریکی میں آپ کے سردار کے کارندے انہی بلوچوں کے گھر اجاڑتے ہیں۔ مجھے بتائیے، سردار زارک خان کا کتنا حصہ ان فنڈز میں جاتا ہے جو عوام کے لیے آتے ہیں؟

مرتضیٰ مزارانی نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے چہرے پر دوبارہ وہ مخصوص 'سیاسی اطمینان' سجا لیا۔ اس نے میز پر رکھے کرسٹل کے گلاس کو آہستہ سے گھمایا اور بڑے نپے تلے لہجے میں بولا: "ذیشان صاحب! آپ کی معلومات میں تھوڑی کمی ہے۔ جو فنڈز وفاق سے آتے ہیں، وہ باقاعدہ ایک سسٹم کے تحت ضلعوں میں بانٹے جاتے ہیں۔ ہم نے سڑکیں بنوائی ہیں، اسکولوں کی عمارتیں کھڑی کی ہیں۔ سردار صاحب کا ان فنڈز سے کیا لینا دینا؟ وہ تو خود اپنی جیب سے غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔" وہ رکا، پھر ایک مکرانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا: "اور آپ جو یہ الزام لگا رہے ہیں کہ سردار صاحب بلوچوں کے گھر اجاڑتے ہیں... ذیشان صاحب! سردار زارک خان اس مٹی کے رکھوالے ہیں۔ آج تک کس بلوچ نے شکایت کی ہے کہ سردار نے اس کا گھر اجاڑا ہے؟ ذرا ایک مثال تو دیں؟" میں نے ایک سرد نگاہ مرتضیٰ مزارانی پر ڈالی اور کرسی سے ذرا اور آگے جھک گیا۔ میرا لہجہ اب پہلے سے کہیں زیادہ کاٹ دار تھا۔

"مثال چاہیے آپ کو مرتضیٰ صاحب؟" میں نے اپنے برابر میں بیٹھے شاہ میر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میرے برابر میں بیٹھا شاہ میر بلوچ آپ کے لیے مثال ہے۔ اس کا گھر، اس کی زمینیں اور اس کا سکون کس نے اجاڑا؟ کیا وہ کارندے سردار زارک خان کے نہیں تھے جنہوں نے اس کے خاندان کو دربدر کیا؟" مرتضیٰ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا، مگر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ "اور اگر آپ کی آنکھیں یہ سچ نہیں دیکھ پا رہیں، تو اٹھیں میرے ساتھ! میں آپ کو ان کسانوں کی بستی میں لے چلتا ہوں جن کے حصے کا پانی سردار کی زمینوں کو سیراب کرنے کے لیے غصب کر لیا گیا ہے۔ میں آپ کو ان یتیموں سے ملواتا ہوں جن کے سر سے سایہ اس لیے چھین لیا گیا کیونکہ ان کے باپ نے سردار کے غیر قانونی حکم کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ جسے 'رکھوالی' کہہ رہے ہیں، وہ بلوچوں کا تحفظ نہیں، ان کا استحصال ہے۔" مرتضیٰ مزارانی نے غصے سے تسبیح کے دانے مسلے۔ اس کا سیاسی لبادہ اب تارتار ہو رہا تھا۔ "ذیشان صاحب! آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔آپ کا جوش و خروش اپنی

جگہ، مگر سیاست میں ہر چیز سیاہ اور سفید نہیں ہوتی۔ آپ جس پانی کے غصب ہونے کی بات کر رہے ہیں، وہ دراصل ایک پرانے قبائلی تنازعے کا نتیجہ ہے جسے سردار صاحب نے حل کرنے کی کوشش کی ہے، نہ کہ غصب کرنے کی شاہ میر جیسے چند باغی نوجوانوں کی باتوں میں آ کر آپ پوری قبائلی تاریخ پر سوال نہیں اٹھا سکتے۔

"تاریخ پر سوال میں نہیں، آپ کے اپنے کرتوت اٹھا رہے ہیں،" میں نے دو ٹوک جواب دیا۔ "آپ اسمبلی میں بیٹھ کر جو بجٹ منظور کرواتے ہیں، وہ سڑکوں پر نہیں لگتا، بلکہ ان مسلح جتھوں کی جیبوں میں جاتا ہے جو رات کے اندھیرے میں معصوموں کے گھروں پر دستک دیتے ہیں۔ میرے پاس ان 'ٹرانزیکشنز' کے ثبوت موجود ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ کتنا پیسہ 'ترقی' کے نام پر نکلا اور کتنا 'تخریب کاری' کے لیے استعمال ہوا۔" میں نے اپنی رپورٹ کا وہ صفحہ پلٹا جہاں بیرونی فنڈنگ اور مقامی سرداروں کے گٹھ جوڑ کا ذکر تھا۔ "اب بتائیے مرتضیٰ صاحب! کیا آپ اب بھی کہیں گے کہ سردار صاحب بے قصور ہیں؟ یا میں یہ سمجھوں کہ اس بہتی گنگا میں آپ کے ہاتھ بھی رنگے ہوئے ہیں؟"
مرتضیٰ مزارانی نے ایک گہری سانس لی اور اپنی کرسی پر ذرا سا آگے جھکتے ہوئے بڑے پر اعتماد لہجے میں بولا: جہاں تک فنڈز کی بات ہے، تو آڈٹ رپورٹس موجود ہیں، ہم ایک ایک پائی کا حساب دے سکتے ہیں۔"
میں نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور پہلا وار کیا: "بہت خوب مرتضیٰ صاحب! اگر آڈٹ رپورٹس اتنی ہی شفاف ہیں تو پھر تربت اور آواران کے ان اسکولوں کے لیے نکلا ہوا فنڈ کہاں گیا جن کی صرف دیواریں کھڑی ہیں اور چھتیں غائب ہیں؟ کیا وہ فنڈ بھی کسی 'قبائلی تنازعے' کی نذر ہو گیا؟" مرتضیٰ کے ماتھے پر پہلا بل پڑا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے دوسرا سوال داغ دیا: "اور مرتضیٰ صاحب! اگر سردار صاحب اتنے ہی بڑے رکھوالے ہیں، تو ان کے نجی گارڈز کے پاس وہ جدید اسلحہ کہاں سے آیا جو صرف ہماری فوج کے پاس ہونا چاہیے؟ کیا یہ اسلحہ بھی کسی 'آڈٹ رپورٹ' کا حصہ ہے یا اس کا راستہ سرحد پار سے بنتا ہے؟"

مرتضیٰ مزارانی کے چہرے کا رنگ ایک دم فق ہو گیا۔ اس نے تسبیح کی مالا میز پر رکھی اور کڑی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا، "ذیشان صاحب! آپ اب ایک صحافی کے روپ میں نہیں لگ رہے۔ آپ کے سوالات بتا رہے ہیں کہ آپ کسی خاص مشن پر ہیں یا کسی کے بھیجے ہوئے ہیں۔"
میں نے قہقہہ لگایا، "مرتضیٰ صاحب! آپ نے ٹھیک سمجھا۔ میں صحافی ہوں یا نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ میرے قلم کی سیاہی ان ماؤں کی دعاؤں اور ان مظلوموں کے آنسوؤں سے بنتی ہے۔ میں یہاں کسی کا ایجنٹ بن کر نہیں، سچ کا سفیر بن کر آیا ہوں۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہے تو میں وہ بھی لکھنے کو تیار ہوں، آپ بتائیے آپ کا موقف

کیا ہے؟"
مرتضیٰ مزارانی نے اپنے لہجے کو تھوڑا نرم کیا، جیسے وہ مجھے بھانپنے کی کوشش کر رہا ہو، "دیکھیں ذیشان صاحب، فائنل بات بتائیں، آپ چاہتے کیا ہیں؟"
میں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا، "مجھے حل بتائیں! یہ جو لاپتہ افراد کا زخم ہے، یہ کیسے بھرے گا؟ یہ مائیں کب تک خیموں میں بیٹھیں گی؟ مجھے اس کا کوئی ٹھوس اور عملی حل دیں جو میں اپنے اخبار میں چھاپ سکوں۔"
مرتضیٰ مزارانی نے ایک مکرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کرسی پر پیچھے ٹیک لگائی، "حل بہت سادہ ہے ذیشان صاحب۔ ہم ایک گرینڈ جرگہ بلائیں گے، تمام متاثرین کو سردار صاحب کے دربار میں بلایا جائے گا، وہاں ان کی شکایات سنی جائیں گی اور جن کے بچے واقعی بے قصور ہوئے، سردار صاحب خود ان کی رہائی کے لیے ریاست سے بات کریں گے۔ ہم معاوضہ بھی دیں گے اور روزگار بھی۔"اس نے یہ بات اتنے اعتماد سے کہی جیسے وہ بہت بڑا مسیحا ہو، مگر میں اس کی آنکھوں میں چھپی عیاری صاف دیکھ سکتا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ 'جرگہ' اور 'معاوضہ' صرف ایک نئی چال ہے تاکہ احتجاج ختم ہو جائے اور سردار کی دھاک بھی بیٹھ جائے۔ وہ حل نہیں نکال رہا تھا، بلکہ سچ کو ایک نئے کفن میں دفن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔میں نے دھیمے لہجے میں کہا آپ کا 'حل' میں نے نوٹ کر لیا ہے مرتضیٰ صاحب۔ اب دیکھتے ہیں کہ مٹی کے نصیب میں انصاف لکھا ہے یا صرف ایک اور جرگہ۔" مرتضیٰ مزارانی کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی، جیسے اس نے "گرینڈ جرگے"کا لالی پاپ دے کر میرا منھ بند کر دیا ہو۔ میں نے اسے جواب تو دے دیا تھا، مگر میرا لہجہ اب کسی حتمی فیصلے کی طرح بھاری تھا۔
میں نے اپنی نوٹ بک بند کی، قلم جیب میں لگایا اور کھڑا ہو گیا۔ مرتضیٰ مزارانی نے مجھے اٹھتے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھری—جیسے وہ یہ بھانپنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں اس کی چال میں آ گیا ہوں یا نہیں۔
"آپ کے 'حل' کا شکریہ مرتضیٰ صاحب،" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "مگر یاد رکھیے گا، جرگے انصاف کے لیے ہوتے ہیں، سچ پر مٹی ڈالنے کے لیے نہیں۔ اگر آپ کو لگتا ہے کہ ایک اور مصلحتی بیٹھک ان ماؤں کے دکھوں کا مداوا کر دے گی، تو شاید آپ نے ابھی تک ان کی آنکھوں کا کرب پڑھا ہی نہیں ہے۔"
مرتضیٰ مزارانی بھی اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی واسکٹ کے بٹن درست کرتے ہوئے بولا، "ذیشان صاحب، آپ کی ہمت اور قلم کی کاٹ کا میں معترف ہوں، مگر صحافت اور حقیقت میں ایک باریک لکیر ہوتی ہے۔ آپ جذبات کی رو میں بہہ رہے ہیں، اور میں زمینی حقائق کی بنیاد پر بات کر رہا ہوں۔ خیر، آپ کا اپنا راستہ ہے، ہمارا اپنا۔"
اس نے ایک مکرانہ انداز میں ہاتھ ملانے کے لیے بڑھایا۔ "امید ہے آپ اپنی رپورٹ میں ہمارا یہ 'مثبت حل' ضرور لکھیں گے۔" میں نے رسمی طور پر ہاتھ ملایا جس کی گرفت میں کوئی گرمجوشی نہیں تھی اور کہا، میں صرف وہی لکھوں

گا جو سچ ہے۔ اجازت چاہتا ہوں۔
شاہ میر، جو اب تک کسی سائے کی طرح خاموش کھڑا تھا، میرے ساتھ باہر کی طرف مڑا۔ مرتضیٰ مزارانی نے ہمیں جاتے ہوئے دیکھ کر اپنے مخصوص سیاسی انداز میں الوداعی کلمات کہے، "اللہ حافظ ذیشان حیدر صاحب! کوئٹہ کے پہاڑ مہمانوں کو بھولتے نہیں، بس آنے والے سچ کی قیمت جانتے ہوں۔"
ہم اس کے شاہانہ مطالعہ گاہ سے نکل کر دوبارہ اس لمبی راہداری میں آئے جہاں کی دیواروں پر لگی تصویریں اب مجھے کسی قدیم جیل کی سلاخیں لگ رہی تھیں۔ باہر نکلے تو وہی تیز دھوپ اور مسلح گارڈز کا پہرہ تھا۔ میں نے ایک لمبا سانس لیا، جیسے اس گھٹن زدہ ماحول سے نکل کر پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھر رہا ہوں۔ شاہ میر نے گیٹ سے باہر نکلتے ہی مجھ سے پوچھا، "ذیشان بھائی، آپ نے اس کے جرگے والی بات مان لی؟ کیا واقعی آپ کو لگتا ہے کہ یہ لوگ حل نکالیں گے؟"
میں نے گیٹ کے باہر کھڑے ہو کر پیچھے اس عالیشان بنگلے کی طرف دیکھا، جہاں مرتضیٰ مزارانی کی مکاری دیواروں سے جھانک رہی تھی، اور ایک پُر اعتماد لہجے میں کہا: شاہ میر، جرگہ حل ہے یا جال، یہ ایک الگ بحث ہے۔ مگر یاد رکھو، ان ایوانوں تک جانے کا مقصد صرف فائلیں جمع کرنا نہیں تھا۔ میرا مقصد ان کے ماتھے پر یہ پسینہ لانا تھا کہ اب مظلوم سوئے ہوئے نہیں ہیں، اب خاموشی ٹوٹ چکی ہے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ پیغام دے دیا ہے کہ تم کتنے ہی اونچے قلعوں میں چھپ جاؤ، سچ تمہارا تعاقب کرے گا۔"

شاہ میر نے مجھے غور سے دیکھا تو میں نے بات جاری رکھی: "انہیں اب سکون کی نیند نہیں ملے گی۔ اب وہ جب بھی کسی 'سودے' کی بات کریں گے، انہیں یاد آئے گا کہ ایک قلم ایسا بھی ہے جو خریدا نہیں جا سکتا۔ ہم نے انہیں اس نہج پر لا کھڑا کیا ہے کہ اب وہ 'کچھ نہ کچھ' کرنے پر مجبور ہوں گے۔ چاہے وہ دکھاوے کا جرگہ ہی کیوں نہ ہو، ریاست اور ان کے درمیان جو 'خاموش مفاہمت' تھی، ہم نے اس میں دراڑ ڈال دی ہے۔ اب انہیں جواب دینا پڑے گا، کیونکہ اب سوال گلیوں سے نکل کر ان کے ڈرائنگ رومز تک پہنچ گیا ہے۔"
شاہ میر کے چہرے پر ایک اطمینان سا آیا، "یعنی آپ کا مطلب ہے کہ ہم نے ان کی بے فکری چھین لی ہے؟" بالکل شاہ میر!" میں نے شائستگی سے کہا۔ "طاقتور کی سب سے بڑی شکست یہ نہیں کہ اسے ہرا دیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ اسے یہ احساس دلا دیا جائے کہ وہ اب ناقابلِ تسخیر نہیں رہا۔ چلو، اب ہمیں اگلی چال چلنی ہے، اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکیں۔

چوتھا باب۔۔۔۔۔۔سرداروں کے حصار میں

ذیشان بھائی! اب آگے کا کیا پلان ہے؟ شاہ میر نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ میں نے سڑک کنارے رک کر ایک گہرا سانس لیا اور شاہ میر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا:

"شاہ میر، اب ہمیں نوشکی جانا ہے۔ میں نے سردار مہر اللہ کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے، مگر اب مجھے خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہے کہ وہ اصل میں کس کا آدمی ہے۔ سنا ہے اسے ریاست سے بڑے گلے شکوے ہیں اور وہ سسٹم سے کافی ناراض رہتا ہے۔ میں اس کے پاس جا کر یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس کی یہ ناراضگی صرف دکھاوا ہے یا واقعی اسے ریاست کی پالیسیوں سے کوئی اصولی اختلاف ہے؟ مجھے اس سے یہ پوچھنا ہے کہ وہ ریاست کے بارے میں اتنی سخت باتیں کیوں کرتا ہے اور اس کا اصل مقدمہ کیا ہے؟ اس کا رخ پہچانے بغیر ہم اس پہیلی کو نہیں سلجھا سکیں گے۔"

شاہ میر نے سنجیدگی سے جواب دیا نوشکی کوئی عام جگہ نہیں ہے، وہ ایک بہت خطرناک علاقہ ہے اور وہاں کا سردار مہر اللہ... وہ مرتضیٰ مزارانی جیسا نہیں ہے جو کیمرے کے سامنے مسکرائے۔ وہاں قانون سردار کی مرضی سے شروع ہوتا ہے اور اس کی ناراضگی پر ختم۔

میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر سنجیدگی سے کہا:"شاہ میر، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اب تک جن لوگوں سے میں ملا—چاہے وہ ڈی آئی جی ہو، سرکاری افسران ہوں یا یہ مزارانی—ان تک پہنچنا آسان تھا کیونکہ ان کے دفاتر تھے، ان کا ایک سرکاری طریقہ کار تھا۔ مگر ان سرداروں کے ڈیرے تک کیسے پہنچا جائے؟ میرے پاس تو کوئی تعارف بھی نہیں ہے اور نہ ہی میں وہاں کی روایات سے واقف ہوں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ سردار مجھے ملنا پسند کرے گا یا پہلے سوال پر ہی اپنے گارڈز کو اشارہ کر دے گا۔"

شاہ میر نے میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں کہا: بھائی، آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو نہیں پتہ، لیکن آپ کا یہ بھائی نوشکی کے چپے چپے سے واقف ہے۔ وہاں سرکاری کارڈ نہیں، 'خون کا رشتہ' اور 'مٹی کی وفاداری' کام آتی ہے۔وہاں میرا ایک بہت قریبی جاننے والا ہے، کاکا جمعہ

وہ سردار مہر اللہ کا ایک پرانا اور وفادار ملازم رہا ہے،، سردار اس کی بات نہیں ٹالتا۔کاکا جمعہ کا بیٹا پچھلے سال ایک واقعے میں مارا گیا تھا اور سردار اسے اپنے بیٹے کی طرح مانتا تھا۔ کاکا جمعہ اب شہر کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی میں رہتا ہے۔ ہم پہلے اس کے پاس جائیں گے۔ اسے لگے گا کہ آپ لاہور سے اس کے بیٹے کا مقدمہ لڑنے آئے ہیں۔ وہی

ہمیں سردار کے ڈیرے تک لے جائے گا۔"آپ میرا ہاتھ تھامیں، میں آپ کو ان پہاڑوں کے سینے تک لے جاؤں گا جہاں سچ دفن ہے۔
میں نے شاہ میر کا عزم دیکھا تو میرا حوصلہ بڑھ گیا، مگر پھر بھی ایک انجانا سا ڈر میرے دل میں دستک دے رہا تھا۔
میں نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا اور کہا: ٹھیک ہے شاہ میر! تو پھر ہمارا پہلا اسٹاپ کاکا جمعہ کی بستی ہوگی۔ ہم اسے بتائیں گے کہ ہم اس کے بیٹے کی موت کا سچ ڈھونڈ رہے ہیں، اور یہی سچ ہمیں سردار کے دربار تک لے جائے گا۔ لیکن شاہ میر، ایک بات ہمیں ذہن میں رکھنی چاہیے۔ مرتضیٰ مزارانی سے ملاقات کے بعد اب خبر سردار زارک خان تک بھی پہنچ چکی ہوگی۔ اب ہم ان کی نظروں میں پہلے سے زیادہ آ چکے ہیں۔ نوشکی ویسے ہی خطرناک علاقہ ہے اور ان کے مخبر ہر گلی، ہر موڑ پر موجود ہوں گے۔ ہمارے لیے اب ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوگا۔"
شاہ میر کے چہرے پر ایک عجیب سی سختی آئی، اس نے اپنی چادر کو درست کیا اور بڑے مان سے بولا: ذیشان بھائی آپ کا کام سچ لکھنا ہے، اور میرا کام اس سچ کی حفاظت کرنا ہے۔ آپ قلم چلائیں، میں ہتھیار چلاؤں گا۔ آپ کے پاس لفظوں کی طاقت ہے، میرے پاس ان پہاڑوں کے راستوں اور ان خطروں سے نمٹنے کا ہنر ہے۔ویسے تو یہاں کسی پنجابی کے لیے اکیلے آنا مسئلہ بن سکتا ہے، لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں، لیکن جب میں آپ کے ساتھ ہوں تو کوئی آپ کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ میں آپ کا بھائی بن کر ساتھ کھڑا ہوں، اور بلوچی غیرت کا تقاضا ہے کہ بھائی کی حفاظت کے لیے گردن کٹا دی جائے۔اس کی باتوں نے میرے خدشات کو حوصلے میں بدل دیا۔ ہم دونوں تیز قدموں سے سڑک پر کھڑی اسی پیلی ٹیکسی کی طرف بڑھے جس پر ہم آئے تھے۔ شاہ میر نے آگے بڑھ کر ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور ہم اندر بیٹھ گئے۔"نوشکی، کلی قاسم!" شاہ میر نے ڈرائیور کو مختصر ہدایت دی اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ کوئٹہ کے مضافات شروع ہو رہے تھے اور شاہ میر خاموشی سے کھڑکی سے باہر پھیلے سنگلاخ پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا، جیسے وہ آنے والے خطرے کو بھانپنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ٹیکسی کوئٹہ کے پر ہجوم بازاروں سے نکل کر کھلی سڑک پر آئی تو گھڑی کی سوئیاں ساڑھے بارہ بجا رہی تھیں۔ سورج سر پر تھا اور گاڑی کے ٹائروں کے نیچے سے نکلتی ہوئی سڑک کسی سیاہ سانپ کی طرح پہاڑوں میں گم ہو رہی تھی۔ ذیشان بھائی،" شاہ میر نے خاموشی توڑی، "نوشکی پہنچنے سے پہلے ہمیں اپنی شناخت بدلنی ہوگی۔ آپ کا یہ صاف ستھرا لباس اور یہ پالش ہوئے جوتے وہاں کے مخبروں کو فوراً بتا دیں گے کہ کوئی 'صاحب لوگ' شہر سے آیا ہے۔"
اس نے اپنی واسکٹ کی جیب سے ایک بلوچی پٹکا (پگڑی) نکالا اور میری طرف بڑھایا۔ "اسے سر پر لپیٹ لیں اور اپنی یہ عینک جیب میں رکھ لیں۔ جب ہم کاکا جمعہ کی بستی میں اتریں گے، تو آپ صرف میرے ایک دوست ہوں گے جو ایک دکھ درد بانٹنے آیا ہے۔"
سفر کٹتا رہا۔ ہم مستونگ سے گزر کر جب تفتان ہائی وے پر چڑھے تو سڑک مزید سنسان ہو گئی۔ سورج کی تمازت

میں دور تک پھیلے خشک پہاڑ تپ رہے تھے اور تپتی سڑک سے اٹھتی بھاپ منظر کو دھندلا رہی تھی۔ کھڑکی سے باہر نظر ڈالنے پر کبھی کبھار کوئی اونٹ یا خانہ بدوشوں کا تھکا ہارا قافلہ گرد اڑاتا نظر آتا۔ تقریباً تین بجے کے قریب ہم نوشکی کے مضافات میں واقع 'کلی قاسم' کے قریب پہنچے۔ دور سے مٹیالے مکانات اور اڑتی ہوئی دھول نے ہمارا استقبال کیا۔ شاہ میر نے بائی پاس کے قریب ٹیکسی رکوائی اور ہم ایک کچی پگڈنڈی پر پیدل چلتے ہوئے کاکا جمعہ کے دروازے تک پہنچ گئے۔

شاہ میر نے مخصوص انداز میں دستک دی تو ایک ضعیف مگر پروقار بوڑھا سامنے آیا۔ شاہ میر کو دیکھتے ہی اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر رونق آ گئی، مگر جب اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ تھوڑا ٹھٹکا۔ "کاکا، یہ میرے بھائی ہیں، لاہور سے آئے ہیں،" شاہ میر نے تعارف کروایا۔

کاکا جمعہ نے ہمیں اندر بٹھایا اور فوراً کھانا لانے کی ضد کی۔ میں نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور کہا، "کاکا، آپ کی محبت کا شکریہ، ہم نے راستے میں تھوڑا بہت کھا لیا تھا۔ بس آپ کی دعائیں اور تھوڑی سی چائے مل جائے تو تھکن اتر جائے گی۔"

کاکا جمعہ نے چائے کا انتظام کیا اور پھر میری طرف دیکھ کر بلوچی لہجے میں پوچھا، "بیٹا، تم پنجابی ہو، سنا ہے وہاں کے لوگ ہمارے دکھوں سے ناواقف ہیں؟ تم یہاں کیا ڈھونڈنے آئے ہو؟"

میں نے نہایت احترام سے ان کا ہاتھ تھاما اور کہا، "کاکا، یقین جانیں، ہم پنجابی آپ کو اپنا بھائی مانتے ہیں۔ آپ کے بیٹوں کا دکھ ہمارا دکھ ہے۔ میں یہاں کسی سیاست کے لیے نہیں، بلکہ ان آنسوؤں کا حساب مانگنے آیا ہوں جو اس مٹی پر گرے ہیں۔ آپ مجھے اپنا مہمان نہیں، اپنا بیٹا سمجھیں۔"

کاکا جمعہ نے چائے کا پیالہ میرے سامنے رکھا، تو میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ سوال کر دیا جو کافی دیر سے میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ "کاکا، ایک بات پوچھوں؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "سنا ہے یہاں کے لوگ پنجابیوں سے بہت نفرت کرتے ہیں؟ مجھے لاہور میں بہت سے لوگوں نے ڈرایا تھا کہ وہاں مت جانا، بلوچ تمہیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے کاکا؟ کیا ہم واقعی آپ کی نظر میں اتنے برے ہیں؟"

میرا سوال سن کر کاکا جمعہ کی آنکھوں میں ایک لرزش سی آئی۔ انہوں نے چائے کا گھونٹ بھرا اور بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "سچ تو یہ ہے کہ عام بلوچ کے سینے میں پنجابیوں کے لیے کوئی بیر نہیں ہے۔ ہم تو سب کو اپنا بھائی مانتے ہیں، بس یہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے کچھ شکاری ہیں جو اپنی سیاست کی دکان چمکانے کے لیے ہمیں آپس میں لڑوا دیتے ہیں۔ تم یہاں مہمان بن کر آئے تھے، مگر اب اس گھر کے فرد ہو۔ ہماری نفرت ان سے ہے جو ہمارے حقوق غصب کرتے ہیں، ان سے نہیں جو ہمارے دکھ بانٹنے لاہور سے چل کر یہاں آتے ہیں۔"

میں نے موقع دیکھ کر دھیمے لہجے میں پوچھا، "کاکا، شاہ میر نے بتایا کہ آپ کا بیٹا... وہ کیسے اس آگ کی بھینٹ چڑھ

گیا؟"
کاکا جمعہ نے ایک لمبی آہ بھری اور سامنے دیوار پر لگی ایک دھندلی تصویر کو دیکھنے لگا۔ "وہ ابھی جوان تھا بیٹا، خواب دیکھتا تھا کہ یہاں اسکول بنیں، ہسپتال بنیں۔ ایک رات وہ گھر نہیں آیا۔ کچھ کہتے ہیں اسے شدت پسند لے گئے کہ وہ ان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا، اور کچھ کہتے ہیں کہ ریاست کے اہلکار اسے اٹھا کر لے گئے کہ وہ حق کی بات کرتا تھا۔ بس وہ ان دو پاٹوں کے درمیان پس گیا۔ اس کی لاش ملی تو اس پر تشدد کے نشانات تھے، مگر یہ پتہ نہ چلا کہ وہ کس کے ہاتھوں مرا۔ وہ اس مٹی کی بے حسی کا شکار ہو گیا۔"
کاکا جمعہ کی آواز میں ایک ایسی تھکن تھی جیسے وہ برسوں کا بوجھ ڈھو رہے ہوں۔ میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اگلا سوال کیا:
"کاکا! کیا آپ انتظامیہ کے پاس نہیں گئے؟ کیا ان سرداروں نے آپ کی کوئی مدد نہیں کی؟ آخر کسی کو تو اس کا حساب دینا چاہیے تھا!"

کاکا نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا۔ "بیٹا! انتظامیہ کے دفتروں کے چکر کاٹ کاٹ کر میری جوتیاں گھس گئیں۔ وہاں بس فائلیں بنتی ہیں، جواب نہیں ملتا۔ رہی بات سرداروں کی، تو ان کے درباروں میں بھی حاضری دی۔ سردار مہر اللہ نے ہمدردی تو جتائی، ریاست کو برا بھلا بھی کہا، مگر میرے بیٹے کا سراغ کوئی نہ دے سکا۔ اب اس اندھیرے میں کس کو پکاروں؟ کسے غلط کہوں اور کسے صحیح؟ یہاں سچ بولنے والے کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور ہم جیسے بوڑھے بس تصویریں دیکھ کر جیتے ہیں۔"
انہوں نے اپنی کانپتی ہتھیلیوں کو دیکھا اور بات جاری رکھی، "بس بیٹا! اب تو یہ حال ہے کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ گولی کس کی تھی اور اٹھانے والا کون تھا۔ ہم بس جنازے اٹھانے کے لیے رہ گئے ہیں۔"
کاکا جمعہ کی آنکھوں میں اپنے بیٹے کا ذکر سن کر جو نمی اتری تھی، وہ اب ایک گہری سوچ میں بدل گئی۔ میں نے ان کے لرزتے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور بڑے یقین سے کہا:
"کاکا! آپ اکیلے نہیں ہیں۔ میں یہاں صرف رپورٹنگ کرنے نہیں آیا، میں آپ کے بیٹے کا مقدمہ لڑنے آیا ہوں۔ میں سردار مہر اللہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھوں گا کہ اس کے علاقے میں ایک باپ اپنے جوان بیٹے کی لاش کیوں اٹھاتا ہے؟ اور پھر یہی سوال میں ریاست کے ایوانوں اور انتظامیہ کے سامنے بھی رکھوں گا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون سے ہاتھ ہیں جو سچ بولنے والوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور وہ کون سی طاقتیں ہیں جو ایک باپ کو انصاف کے بجائے صرف فائلیں تھما دیتی ہیں۔"
میری باتیں سن کر کاکا کے چہرے پر ایک عجیب سی حیرت اور خوف کی لہر دوڑی۔ "خیریت ہے بیٹا؟ تم اتنی بڑی

باتیں کر رہے ہو! سردار مہر اللہ کا دربار کوئی عام جگہ نہیں ہے۔ وہاں قدم رکھتے ہی فضا بدل جاتی ہے۔" ویسے یہ بتاؤ کیا تمہاری سردار مہر اللہ سے کوئی ملاقات طے ہے؟ کیا اس نے تمہیں بلایا ہے؟"
میں نے دھیرے سے سر نفی میں ہلایا۔ "نہیں کاکا، میری کوئی ملاقات طے نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس نظام اور سختی کا آپ ذکر کر رہے ہیں، وہاں کسی انجان شخص کا بن بلائے چلے جانا نہ تو مناسب ہے اور نہ ہی ممکن۔ میں نہیں چاہتا کہ ایک اجنبی اور وہ بھی پنجاب سے، براہِ راست ان کے ڈیرے پر بن بلائے مہمان بن کر پہنچ جائے، کیونکہ یہ وہاں کی روایات کے بھی خلاف ہوگا۔ اسی لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں، کیونکہ آپ کی موجودگی اس ملاقات کو ایک باوقار شکل دے سکتی ہے۔ میں آپ کے ذریعے ایک باقاعدہ طریقے سے ان تک رسائی چاہتا ہوں۔"

کاکا جمعہ کے چہرے پر ایک ادھوری سی مسکراہٹ آئی۔ "میری معرفت؟" انہوں نے دہرایا۔ "اچھا! تو یہ بات ہے۔ ٹھیک ہے بیٹا، اگر تم نے ٹھان ہی لی ہے تو میں تمہیں لے جاؤں گا۔ سردار مہر اللہ میری بہت عزت کرتا ہے، میرا اس کے ڈیرے پر اٹھنا بیٹھنا ہے۔ میں تمہیں آج شام کو ہی اپنے ساتھ لے کر چلوں گا، وہ اس وقت اپنے ڈیرے پر ہی موجود ہوگا۔ میرا ویسے بھی اس سے ایک کام تھا، اس نے مجھے بلایا ہوا ہے۔ تمہیں اس کے سامنے بٹھانا اور وہاں تک پہنچانا میرا کام ہے۔ وہ تھوڑا قریب ہوئے اور رازداری سے بولے، "مگر دیکھو بیٹا! ایک بات پھر کہہ رہا ہوں، سوال سوچ سمجھ کر کرنا۔ وہ اپنے لوگوں کا ہمدرد تو ہے، مگر ریاست کا نام سنتے ہی اس کا لہجہ زہر آلود ہو جاتا ہے۔ وہ تو صاف کہتا ہے کہ 'ریاست نے میرے ہاتھ نہ باندھتی اور ہمیں اپنے وسائل پر اختیار دیتی، تو میں نوشکی میں دودھ کی نہریں بہا دیتا'۔ وہ ریاست کی پابندیوں کو اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے۔" تم اس سے جو بھی پوچھو، ذرا سنبھل کر، باقی اس سے نبٹنا تمہارا اپنا کام ہے۔"
میں نے اطمینان سے سر ہلایا اور کہا، "کاکا، بس آپ مجھے اس کے سامنے بٹھا دیں، اس کے بعد کے حالات سے نمٹنا میں خود جانتا ہوں۔"
شام کے چھ بج چکے تھے۔ آسمان پر شفق کی سرخی پھیل رہی تھی اور نوشکی کے سنگلاخ پہاڑ اس نارنجی روشنی میں کسی قدیم داستان کے کردار لگ رہے تھے۔ کاکا جمعہ نے اپنی چادر درست کی اور ہمیں باہر کھڑی ایک پرانی مگر مضبوط جیپ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ جیپ سردار مہر اللہ نے ہی مجھے دے رکھی ہے،" کاکا جمعہ نے فخر سے بتایا۔ "وہ جانتا ہے کہ اس عمر میں مجھ سے پیدل نہیں چلا جاتا۔" ہم جیپ میں سوار ہوئے تو شاہ میر نے ڈرائیور کی ساتھ والی نشست سنبھالی، جبکہ میں اور کاکا جمعہ پیچھے بیٹھ گئے۔ تقریباً نو کلومیٹر کا یہ فاصلہ کچی پگڈنڈیوں اور خشک نالوں سے ہوتا ہوا گزر رہا تھا۔ جیپ کے پہیوں تلے ریت اڑ رہی تھی اور ہوا میں ایک عجیب سی خاموشی تھی، جسے صرف انجن کا شور توڑ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے سفر کے بعد، دور ایک پہاڑی کے دامن میں ایک بلند و بالا قلعہ نما ڈیرہ نظر آنے لگا۔

دیواروں پر لگی سرچ لائٹس روشن ہو چکی تھیں جو دور تک پہرہ دے رہی تھیں۔ جیسے ہی ہماری جیپ ڈیرے کے بھاری لکڑی کے گیٹ کے قریب پہنچی، کلاشنکوف تھامے دو مسلح گارڈز نے راستہ روکا۔ ان کے چہروں پر سختی تھی، مگر جیسے ہی ان کی نظر کاکا جمعہ پر پڑی، ان کے تیور بدل گئے۔ کاکا! خوش آمدید،" ایک گارڈ نے احترام سے سر جھکا کر کہا۔ "سردار صاحب دیوان میں ہی بیٹھے ہیں، آپ شوق سے اندر تشریف لے جائیں۔" گارڈز نے فوراً بھاری گیٹ کھول دیا اور ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ جیپ وسیع صحن میں رکی جہاں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہم نیچے اترے تو کاکا جمعہ ہمیں ایک وسیع برآمدے سے گزار کر ایک بڑے کمرے کی طرف لے گئے جسے وہاں کا دیوان کہا جاتا تھا۔ جیسے ہی ہم دیوان کے اندر داخل ہوئے، فضا میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی کا احساس ہوا۔ کمرہ وسیع تھا، زمین پر قیمتی بلوچی قالین بچھے تھے اور دیواروں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے گاؤ تکیے لگے تھے۔ سامنے کی طرف ایک بلند مسند پر سردار مہر اللہ براجمان تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا ڈھیلا ڈھالا بلوچی لباس پہن رکھا تھا اور سر پر ایک بڑی سیاہ پگڑی اس کے وقار کو مزید بڑھا رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں لمبی کالی تسبیح تھی جس کے دانے وہ تیزی سے گرا رہا تھا، جبکہ اس کے پیچھے دو لمبے تڑنگے محافظ خاموشی سے ہاتھ باندھے کسی بت کی طرح کھڑے تھے۔

کاکا جمعہ نے آگے بڑھ کر روایتی بلوچی انداز میں سلام کیا: "سردار صاحب! اللہ آپ کو خوش رکھے۔" سردار نے تسبیح روکی، ایک گہری سانس لی اور اپنی جگہ پر ذرا سا سیدھا ہوا۔ اس نے کاکا جمعہ کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور بڑے دھیمے مگر رعب دار لہجے میں جواب دیا: "خوش آمدید کاکا!
پھر اس کی نظریں کاکا جمعہ سے ہٹ کر براہِ راست مجھ پر اور میرے پیچھے کھڑے شاہ میر پر جم گئیں۔ اس کی آنکھیں کسی باز کی طرح تیز تھیں جو ایک ہی نظر میں سامنے والے کی نیت بھانپ لیتی ہیں۔ کاکا جمعہ نے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا: "سردار صاحب! یہ لاہور سے آئے ہیں، ذیشان صاحب۔ صحافی ہیں اور بلوچستان کے بارے میں کچھ لکھ رہے ہیں۔ آپ سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔"
کاکا جمعہ نے میرا تعارف کروایا تو سردار مہر اللہ کے چہرے پر کوئی فوری ردِ عمل ظاہر نہ ہوا، بلکہ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی عقابی نظریں مجھ پر جما دیں۔ اس کی آنکھوں میں تجسس بھی تھا اور ایک طرح کا باریک سا طنز بھی، جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ لاہور کی نرم ہواؤں میں پلنے والا یہ صحافی نوشکی کی تپتی ریت اور میرے ڈیرے تک پہنچنے کی ہمت کیسے کر گیا۔

مگر اگلے ہی لمحے اس نے اپنی مسند پر ذرا سا پہلو بدلا اور ہاتھ کے اشارے سے ہمیں اپنے قریب بٹھایا۔ بلوچی رواج کے مطابق اس نے فوراً کام کی بات نہیں چھیڑی بلکہ پہلے "حال احوال" شروع کیا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا—اس

کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ مجھے اس کے جاندار وجود کا احساس ہوا—اور پھر بڑے وقار سے بولا:
"خوش آمدید ذیشان صاحب! آپ لاہور سے ہمارے مہمان بن کر آئے ہیں، اور بلوچ کے ڈیرے پر آنے والا دشمن بھی ہو تو وہ پہلے مہمان ہوتا ہے۔ کام اور ضرورت کی باتیں تو ہوتی رہیں گی، پہلے آپ تھکن اتاریں۔" ایک ملازم نے خاموشی سے چاندی کی پیالیوں میں روایتی سبز قہوہ پیش کیا۔ سردار خود بھی قہوہ کا گھونٹ بھرتا رہا اور مجھ سے لاہور کے موسم، سفر کی سختیوں اور عام حالات کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ اسی مہمان نوازی اور روایتی گفتگو میں گزر گیا۔ اس دوران اس نے مجھے محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ میں کسی اجنبی یا مخالف کے ڈیرے پر ہوں۔ جب قہوہ کا دور ختم ہوا اور فضا میں ایک خاص قسم کا سکون چھا گیا، تو میں نے موقع دیکھ کر نہایت ادب مگر پختہ لہجے میں کہا: "سردار صاحب! آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ۔ سچ تو یہ ہے کہ میں یہاں صرف آپ کا قہوہ پینے نہیں آیا، بلکہ میں آپ کا ایک تفصیلی انٹرویو کرنا چاہتا ہوں تاکہ 'بلوچستان کے مقدمے' میں آپ کا موقف بھی دنیا کے سامنے آ سکے۔"
میری بات سن کر سردار کے لبوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے ایک نظر اپنے محافظوں اور وہاں بیٹھے دیگر لوگوں پر ڈالی اور پھر ایک مختصر سا اشارہ کیا۔ پلک جھپکتے ہی پورا دیوان خالی ہو گیا۔ محافظ بھی باہر نکل گئے اور کاکا جمعہ بھی شاہ میر کے ساتھ دالان کی طرف چلے گئے۔ اب اس وسیع و عریض دیوان میں، دیواروں پر لگی قدیم تلواروں اور ڈھلتے سورج کی مدہم روشنی کے درمیان، صرف میں اور سردار مہر اللہ آمنے سامنے تھے۔ سردار نے تسبیح کا ایک دانہ گرایا اور میری آنکھوں میں جھانک کر بولا: "ٹھیک ہے ذیشان صاحب! اب یہاں کوئی تیسرا نہیں ہے۔ پوچھیے جو پوچھنا ہے، مگر یاد رکھیے گا... یہاں سچ بولنا جتنا آسان ہے، اسے سہنا اتنا ہی مشکل۔

میں نے اپنی نوٹ بک کھولی اور پہلا سوال داغ دیا:
"سردار صاحب! میں نے سنا ہے کہ آپ ریاست سے بہت ناراض ہیں اور اکثر کہتے ہیں کہ اگر ریاست آپ کے ہاتھ نہ باندھتی تو آپ نوشکی میں دودھ کی نہریں بہا دیتے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون سے 'ہاتھ' ہیں جنہوں نے آپ کو اپنے ہی لوگوں کی خدمت سے روک رکھا ہے؟ کیا یہ واقعی ریاست کی رکاوٹ ہے یا سرداری نظام کی اپنی مجبوریاں؟"
سردار مہر اللہ نے تسبیح کا ایک دانہ گرا کر ہاتھ روک لیا۔ اس نے اپنی گردن ذرا اکڑائی اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک آئی جیسے کوئی شکاری اپنے شکار کو پرکھ رہا ہو۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اس کا لہجہ کسی بپھرے ہوئے دریا کی طرح گونج دار ہو گیا۔
"ذیشان صاحب! آپ نے 'دودھ کی نہریں' تو سن لیں، مگر وہ 'زنجیریں' نہیں دیکھیں جن میں ہمیں جکڑا گیا ہے، آپ

پوچھتے ہیں کہ وہ کون سے ہاتھ ہیں؟ تو سنیں! وہ ہاتھ اسلام آباد کے ان ایوانوں کے ہیں جو یہاں سے معدنیات اور گیس تو لے جاتے ہیں، مگر بدلے میں ہمیں صرف 'چیک پوسٹیں' اور 'کرفیو' دیتے ہیں۔"

وہ اپنی مسند پر تھوڑا اور آگے جھکا، اس کی آواز میں اب تلخی واضح تھی:
"آپ اسے 'سرداری نظام کی مجبوری' کہتے ہیں؟ میاں! ہم سردار تو اس مٹی کے رکھوالے تھے۔ جب ریاست کا وجود بھی نہیں تھا، تب بھی ہم اپنے لوگوں کے دکھ سکھ بانٹتے تھے۔ میں اگر یہاں ہسپتال بنانا چاہوں، تو مجھے این او سی (NOC) کے لیے مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ میں اگر اپنے لوگوں کو ان کے وسائل پر اختیار دینا چاہوں، تو مجھے 'غدار' قرار دے دیا جاتا ہے۔ ریاست کہتی ہے کہ ہم ترقی دیں گے، مگر وہ ترقی کہاں ہے؟ کیا وہ ترقی ان شاہراہوں میں ہے جو صرف فوجی قافلوں کے لیے بنتی ہیں؟" وہ رکا، ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور پھر نہایت کڑواہٹ سے بولا:
"دودھ کی نہریں میں تب بہاتا جب میرے اپنے میرے پاس میرے پہاڑوں کا سونا ہوتا، میرے پاس میرے اپنے دریاؤں کا پانی ہوتا۔ ریاست نے ہمارے ہاتھ 'قانون' کی رسی سے نہیں، بلکہ 'بے اعتباری' کی زنجیر سے باندھ رکھے ہیں۔ ہم سے وفاداری کا ثبوت مانگا جاتا ہے، مگر ہمیں اپنا شہری کبھی مانا ہی نہیں گیا۔
میں نے سردار کے چہرے پر موجود غصے اور اس کے پیچھے چھپے دکھ کو محسوس کیا، مگر میں خاموش نہیں رہا۔ میں نے اپنی پنسل کی نوک کاغذ پر جمائی اور دوسرا سوال داغ دیا:
"سردار صاحب! یہ تو ریاست کا مقدمہ ہو گیا۔ مگر کیا یہ سچ نہیں کہ آپ جیسے سرداروں نے بھی تو اپنے لوگوں کو تعلیم سے دور رکھا تاکہ آپ کی سرداری قائم رہے؟ ریاست پر الزام لگانا آسان ہے، مگر کیا آپ نے خود کبھی ان فنڈز کا صحیح استعمال کیا جو آپ کو ملتے ہیں؟ کیا کاکا جمعہ کے بیٹے جیسے نوجوانوں کی موت کا حساب آپ کے پاس ہے؟"
سردار مہر اللہ کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا، جیسے میں نے کسی بہت پرانے زخم پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ تعلیم؟ فنڈز؟ اور حساب؟" سردار نے ان الفاظ کو اس طرح دہرایا جیسے وہ ان کا مذاق اڑا رہا ہو۔ "ذیشان صاحب! آپ لوگ لاہور میں بیٹھ کر بہت آسانی سے یہ 'سرداروں نے تعلیم سے دور رکھا' والا سبق رٹ لیتے ہیں۔ کبھی آ کر دیکھیں کہ یہاں اسکول کی دیوار کھڑی کرنا کتنا مشکل ہے۔ ہم اسکول بناتے ہیں تو وہ 'گوسٹ اسکول' بن جاتا ہے کیونکہ وہاں استاد بھیجنا ریاست کی ذمہ داری ہے، ہماری نہیں۔ آپ کہتے ہیں ہم نے تعلیم سے دور رکھا؟ میاں! تعلیم یافتہ بلوچ تو اپنے حق کا سوال کرتا ہے، اور ریاست کو وہی 'سوال' تو پسند نہیں۔" ذیشان صاحب! آپ کاکا جمعہ کے بیٹے کے خون کا حساب مجھ سے مانگ رہے ہیں؟" سردار نے دھیمی مگر کاٹ دار آواز میں کہا۔ "کاکا جمعہ میرا اپنا ہے، اس کا دکھ میرا اپنا دکھ ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس مٹی پر آج کوئی نہیں جانتا کہ گولی کس کی تھی اور اٹھانے والا

کون تھا۔ یہاں ایک ایسی دھند چھائی ہوئی ہے جس میں قاتل اور مسیحا کا فرق مٹ چکا ہے۔"
وہ تھوڑا اور آگے جھکا، اس کی آواز میں اب ایک عجیب سی گھٹن تھی:
"آپ اسے 'ذمہ داری' کہتے ہیں؟ میاں! یہاں تو ذمہ داری کی تعریف ہی بدل گئی ہے۔ اگر میں کہوں کہ یہ ریاست کی کوتاہی تھی، تو مجھ پر غداری کا لیبل لگے گا۔ اگر کہوں کہ یہ شدت پسندوں کا کام تھا، تو کل میری اپنی دہلیز پر خون ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم ایک ایسی جنگ کے درمیان پھنس گئے ہیں جہاں مہرہ صرف عام بلوچ بنتا ہے۔ کاکا جمعہ کا بیٹا اس نظام کی بھینٹ چڑھا جہاں 'سچ' گم ہو چکا ہے۔ مجھ سے حساب مانگنے سے پہلے اس دیوار سے حساب مانگیں جس کے پیچھے بیٹھ کر فیصلے ہوتے ہیں اور ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا۔"
میں نے سردار کے اعترافِ بے بسی کو نوٹ بک میں اتارا اور پھر نظریں اٹھا کر براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ میرا لہجہ اب پہلے سے زیادہ سنجیدہ تھا۔
"سردار صاحب! آپ کی بے بسی اپنی جگہ، مگر پھر آپ وہ دعویٰ کیوں کرتے ہیں کہ اگر ریاست ہاتھ نہ باندھتی تو آپ یہاں دودھ کی نہریں بہا دیتے؟ اگر آپ اپنے علاقے کے ایک نوجوان کو 'نامعلوم' گولی سے نہیں بچا سکتے، تو آپ اتنے بڑے وسائل کو کیسے سنبھالتے؟ کیا یہ دعویٰ صرف لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے لیے ہے یا واقعی آپ کے پاس ترقی کا کوئی ایسا نقشہ ہے جو ریاست کے پاس نہیں؟"
میں تھوڑا رکا اور ایک اور چبھتا ہوا سوال جوڑ دیا:
"اور سردار صاحب، یہ بھی بتائیں کہ اس 'مقدمے' میں عام بلوچ کہاں کھڑا ہے؟ اسے تو ریاست سے بھی گلہ ہے اور آپ جیسے سرداروں سے بھی کہ آپ لوگ صرف اپنے مفاد کے وقت ریاست کے خلاف بولتے ہیں، ورنہ آپ کی مراعات تو اسی سسٹم سے جڑی ہوئی ہیں۔"
سردار مہر اللہ نے ایک گہرا اور تیکھا قہقہہ لگایا،اور جواب دیا
ذیشان صاحب! آپ 'دودھ کی نہریں' سن کر شاید کوئی خواب سمجھ بیٹھے ہیں، لیکن یہ خواب نہیں، ایک چھینا گیا حق ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ میں وسائل کیسے سنبھالتا؟ میاں! جس زمین کے سینے میں سونا، تانبا اور گیس بھری ہو، وہاں نہریں بہانے کے لیے کسی جادو کی ضرورت نہیں ہوتی، صرف 'اختیار' کی ضرورت ہوتی ہے۔"
اس نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بات جاری رکھی:
"آج میرا گیس، میرا کوئلہ اور میری معدنیات لاہور اور کراچی کے کارخانوں کو تو چلا رہی ہیں، مگر میرے اپنے گھر میں اندھیرا ہے۔ ریاست کہتی ہے کہ ہم فنڈز دیتے ہیں، مگر وہ فنڈز تو 'خیرات' ہیں جو ہمارے اپنے ہی مال کا ایک فی صد بھی نہیں ہوتے۔ اگر میرے ہاتھ نہ بندھے ہوتے اور اس مٹی کا اختیار میرے پاس ہوتا، تو مجھے اسلام آباد کے سامنے جھولی پھیلانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ میں وہ 'نہریں' اپنے وسائل سے بہاتا، کسی کی بھیک سے نہیں۔"

رہی بات عام بلوچ کی... تو ذیشان صاحب، اسے مجھ سے گلہ ضرور ہو سکتا ہے، کیونکہ میں اس کا اپنا ہوں، وہ مجھ پر حق جتاتا ہے۔ مگر ریاست سے اسے 'گلہ' نہیں، 'خوف' ہے، اور گلے اور خوف میں بہت فرق ہوتا ہے۔ آپ کہتے ہیں میری مراعات اس سسٹم سے جڑی ہیں؟ میاں! اگر میں خاموش ہو جاؤں تو یہی سسٹم مجھے سر آنکھوں پر بٹھائے گا، مگر میری یہ 'ناراضگی' ہی تو اس بات کا ثبوت ہے کہ میں اپنی مراعات کے لیے اپنے لوگوں کے حق کا سودا نہیں کر سکتا۔" یاد رکھیے گا! سردار مہر اللہ کا مقدمہ اس کی اپنی ذات کے لیے نہیں، اس مٹی کی 'انا' کے لیے ہے۔ ریاست ہمیں صرف 'کرائے دار' سمجھتی ہے، جبکہ ہم اس زمین کے 'مالک' ہیں۔"

"سردار صاحب! آپ وسائل کی بات کرتے ہیں، مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ اگر پنجاب یا سندھ کے کارخانے آپ کی گیس یا معدنیات استعمال کرتے ہیں تو اس کے بدلے میں وفاق آپ کو بھاری ٹیکس اور رائلٹی بھی تو دیتا ہے۔ وہ عام پنجابی تو آپ کی گیس کی پوری قیمت ادا کرتا ہے۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کا گلہ عوام سے زیادہ نظام سے ہے؟"

ذیشان صاحب! آپ نے بالکل پتے کی بات کہی۔ سردار نے دبے لہجے میں جواب دیا ہمیں اس عام پنجابی یا سندھی سے کوئی گلہ نہیں ہے جو اپنے چولہے میں جلنے والی گیس کا بل بھرتا ہے۔ وہ بھی ہماری طرح ایک عام انسان ہے جو اس نظام کی چکی میں پس رہا ہے۔ ہمارا گلہ اس 'ٹیکس' یا 'رائلٹی' سے نہیں، بلکہ اس کے 'استعمال' سے ہے۔"وہ تھوڑا اور آگے جھکا اور گویا ہوا:

"آپ کہتے ہیں ہمیں ٹیکس ملتا ہے؟ میاں! وہ ٹیکس کہاں جاتا ہے؟ کیا وہ نوشکی کے ان ہسپتالوں میں لگتا ہے جہاں آج بھی ادویات نہیں ہیں؟ یا وہ تعلیم پر خرچ ہوتا ہے جہاں اسکولوں کی صرف دیواریں کھڑی ہیں؟ ہمیں وہ کاغذ کے ٹکڑے نہیں چاہئیں جنہیں آپ 'ٹیکس' کہتے ہیں، ہمیں وہ حق چاہیے کہ ہماری زمین سے نکلنے والا سونا پہلے ہمارے بچوں کا پیٹ بھرے، پھر کہیں اور جائے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور بات مکمل کی:

"ہمیں عام عوام سے دشمنی نہیں، ہمیں اس 'تقسیم' سے اعتراض ہے جو ایک کو مالک اور دوسرے کو بھکاری بنا دیتی ہے۔ اگر وہ رائلٹی واقعی یہاں لگتی، تو آج نوشکی کی شکل کچھ اور ہوتی۔"

سردار صاحب! آپ ریاست کو تو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں، مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ وفاق جو رائلٹی یا فنڈز بھیجتا ہے، وہ یہاں کے مقامی سرداروں اور ان سیاستدانوں کے ہاتھ میں ہی تو آتے ہیں جنہیں آپ لوگ منتخب کرتے ہیں یا جو خود آپ کے طبقے سے ہیں۔ اگر وہ پیسہ عوام تک نہیں پہنچ رہا، تو اس میں آپ کی اور یہاں کی قیادت کی ذمہ داری بھی تو بنتی ہے نا؟ کیا سی پیک (CPEC) جیسے بڑے منصوبوں میں بھی مقامی قیادت نے اپنا حصہ وصول نہیں کیا؟ آخر عام بلوچ کب تک ریاست اور سرداری نظام کے درمیان پستا رہے گا؟

"ذیشان صاحب! آپ نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم سردار سب فرشتے ہیں۔ ہاں، اس نظام

میں ایسے 'سردار' اور 'سیاستدان' بھی موجود ہیں جنہوں نے اسلام آباد کی جیب سے نکلنے والے چند ٹکڑوں کے بدلے اپنی مٹی کا سودا کر لیا۔ وہ 'سی پیک' کی رنگینیوں میں اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں اور ریاست انہیں ہی اپنا وفادار سمجھتی ہے۔"وہ تھوڑا اور آگے جھکا اور اس کی آواز بھاری ہو گئی:

"مگر آپ کو یہ سمجھنا ہو گا کہ ریاست ہمیشہ ان ہی لوگوں کو یہاں مسلط کرتی ہے جو ان کے 'ہاں میں ہاں' ملائیں۔ جو سردار اپنے حق کی بات کرے، اسے تو فنڈز ملنا دور کی بات، اسے تو جینے کا حق بھی مشکل سے ملتا ہے۔ آپ سی پیک کی بات کرتے ہیں؟ سی پیک کے معاہدوں پر دستخط کرنے والے کیا کوئی عام بلوچ تھے؟ نہیں۔ وہ تو وہی لوگ تھے جنہیں ریاست نے خود چنا تھا۔ ہم جیسے لوگوں کو تو صرف 'سیکیورٹی' کے نام پر اپنی ہی زمینوں سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔

"سردار صاحب! چلیے آپ کی بات مان لی کہ گیس اور معدنیات لاہور اور کراچی چلی گئیں، لیکن اب جو گوادر اور سی پیک کے منصوبے بن رہے ہیں، وہ تو بلوچستان کے اندر ہی ہیں۔ وہ سڑکیں اور وہ بندرگاہ تو یہیں نوشکی، خضدار اور گوادر کی مٹی پر بن رہی ہیں۔ اس میں تو پنجاب کا کوئی قصور نہیں کہ وہ آپ سے کچھ چھین کر لے گیا۔ یہ تو خالصتاً آپ کی اپنی زمین کی ترقی ہے۔ پھر بھی آپ لوگ اسے خوش آمدید کیوں نہیں کہتے؟ کیا آپ کو ڈر ہے کہ اگر عام بلوچ ترقی کر گیا اور خوشحال ہو گیا تو پھر وہ آپ جیسے سرداروں کا محتاج نہیں رہے گا؟ آخر آپ لوگ اس ترقی کے راستے میں دیوار کیوں بن رہے ہیں؟"

ذیشان صاحب! آپ لاہور کے لوگ 'ترقی' کو سیمنٹ، بجری اور سڑکوں میں تولتے ہیں، مگر ہم بلوچ ترقی کو 'اختیار' میں ناپتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں سڑکیں یہاں بن رہی ہیں؟ میاں! سڑک تو قبرستان میں بھی بنتی ہے، مگر وہ مردوں کے کام نہیں آتی۔""آپ پوچھتے ہیں ہم دیوار کیوں بنتے ہیں؟ تو سنیں! اگر آپ کے گھر کے صحن سے میں ایک شاندار سڑک گزار دوں، آپ کے بیڈروم میں ایک فیکٹری لگا دوں اور آپ کے کچن پر غیر ملکیوں کا پہرہ بٹھا دوں، اور پھر آپ سے کہوں کہ 'مبارک ہو ذیشان صاحب، آپ کا گھر بہت ترقی کر گیا ہے'، تو کیا آپ اسے ترقی مانیں گے؟ یا اسے اپنے گھر پر قبضہ کہیں گے؟"

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور کڑواہٹ سے کہا:

"گوادر کی بندرگاہ بلوچ کی تقدیر بدلنے کے لیے نہیں، بلکہ دنیا کی تقدیر بدلنے کے لیے بنی ہے۔ آپ گوادر میں باڑ لگا رہے ہیں، آپ سیکیورٹی کے نام پر ہمارے ہی لوگوں کو اپنی زمین پر 'اجنبی' بنا رہے ہیں۔ جب ایک عام بلوچ اپنے ہی ساحل پر مچھلی پکڑنے نہیں جا سکے گا، تو وہ ان سڑکوں کو چاٹ کر اپنا پیٹ بھرے گا؟"

آپ کو لگتا ہے کہ عام بلوچ ہم جیسے سرداروں کا محتاج ہے؟ نہیں! اسے اس 'ترقی' نے محتاج بنا دیا ہے جس میں سڑک تو ہماری زمین سے گزرتی ہے مگر اس پر چلنے والی گاڑی کا رخ ہماری خوشحالی کی طرف نہیں ہے۔ اب بتائیے...

کیا آپ اپنے ہی گھر میں 'مہمان' بن کر جینا پسند کریں گے؟"
ہمیں سرداری چھن جانے کا ڈر نہیں، ہمیں اس دن کا خوف ہے جب یہاں کا اصل وارث اپنی ہی مٹی پر 'دیہاڑی دار مزدور' بن کر رہ جائے گا اور فیصلے کہیں اور بیٹھے لوگ کریں گے۔ یہ ترقی نہیں، یہ ہماری شناخت کا سودا ہے۔"
سردار صاحب! آپ کی 'گھر اور قبضے' والی مثال سننے میں تو بہت اثر انگیز ہے، مگر ذرا حقیقت پسندی سے تو سوچیں۔ جب آپ کے صحن سے سڑک گزرے گی یا گھر میں بجلی اور فیکٹری لگے گی، تو کیا اس سے صرف غیر ملکیوں کا فائدہ ہوگا؟ بجلی تو آپ کے گھر میں بھی جلے گی، سڑک تو آپ کے بچوں کے کام بھی آئے گی اور فیکٹری میں نوکریاں تو یہیں کے لوگوں کو ملیں گی۔ جب پوری دنیا اس معاشی دوڑ میں شامل ہو رہی ہے، تو آپ اسے صرف 'خطرہ' کیوں کہہ رہے ہیں؟ کیا ایک جدید اور ترقی یافتہ بلوچستان آپ کے سرداری وقار سے زیادہ اہم نہیں ہے؟ آخر آپ اس عالمی تعاون (Global Cooperation) سے اتنا کیوں ڈر رہے ہیں؟"
ذیشان صاحب! آپ نے 'عالمی تعاون' کا بہت خوبصورت نام دیا ہے، مگر جس 'بجلی' کی آپ بات کر رہے ہیں، اس کا سوئچ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں فیکٹری میں نوکری ملے گی؟ میاں! اپنے ہی گھر کے مالک کو اس کے اپنے ہی باورچی خانے میں 'دیہاڑی دار مزدور' بنا دینا تعاون نہیں، تذلیل ہوتی ہے۔"
وہ رکا اور اپنی کالی تسبیح کو انگلی پر گھماتے ہوئے بولا:
"ہم جدیدیت سے نہیں ڈرتے، ہم 'بے اختیاری' سے ڈرتے ہیں۔ جب باہر کی کمپنیاں اور ملک یہاں آئیں گے، تو وہ اپنے ساتھ اپنی زبان، اپنا قانون اور اپنا اثر و رسوخ لائیں گے۔ کل کو جب وہ یہاں کے وسائل سمیٹ کر چلے جائیں گے، تو پیچھے کیا بچے گا؟ صرف کھوکھلے پہاڑ اور زہریلا دھواں؟ ہمیں ایسی ترقی نہیں چاہیے جو ہمیں اپنے ہی بزرگوں کی قبروں پر 'اجنبی' بنا دے۔ تعاون تب ہوتا ہے جب دونوں فریق برابر ہوں، یہاں تو ایک طرف 'بندوق' ہے اور دوسری طرف 'بھوک'۔ آپ بتائیے، کیا بھوکا شخص کبھی برابر کی بنیاد پر سودا کر سکتا ہے؟"
سردار صاحب! آپ کی باتیں مجھے بے بس کر رہی ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب 'قبضہ' ہے، تو پھر حل کیا ہے؟ کیا ان پہاڑوں پر بیٹھے نوجوانوں کا ریاست سے گولی کے ذریعے لڑنا صحیح ہے؟ کیا بندوق ہی اس 'اختیار' کو حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے؟"
سردار مہر اللہ کے چہرے پر ایک گہری سنجیدگی چھا گئی۔
اس نے نظریں جھکا کر اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھا اور پھر سر اٹھا کر بہت دھیمے مگر ٹھوس لہجے میں بولا:
ذیشان صاحب! آپ لاہور کے لوگ 'بندوق' اور 'امن' کی باتیں اس ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کرتے ہیں جہاں چھت سے پنکھا اور دیوار سے انصاف لٹکا ہوتا ہے۔ آپ مجھ سے ' صحیح اور غلط' کا فتویٰ مانگ رہے ہیں؟ میاں! جس دن آپ کے جوان بھائی کی مسخ شدہ لاش کسی ویرانے سے ملے اور ریاست اسے 'حساب برابر' کہے، اس دن مجھ سے آ کر

پوچھے گا کہ بندوق اٹھانا صحیح ہے یا غلط۔"
میں جانتا ہوں کہ گولی کسی مسئلے کا حل نہیں، مگر آپ مجھے بتائیں کہ جب ایک نوجوان دیکھتا ہے کہ اس کا باپ سچ بولنے پر لاپتہ ہو گیا، اس کی بہن کی تعلیم کے لیے اسکول نہیں ہے اور اس کی اپنی زمین کا سونا دوسروں کے محل سجا رہا ہے، تو وہ کیا کرے؟ وہ ڈگری لے کر نوکری کی بھیک مانگے یا اپنے حق کے لیے پہاڑ کا راستہ اختیار کرے؟"وہ تھوڑا رکا اور کڑواہٹ سے بولا:
"ریاست اسے 'دہشت گرد' کہتی ہے، اور وہ خود کو 'آزادی کا سپاہی' سمجھتا ہے۔ یہ بندوق دراصل اس 'ناامیدی' کا نام ہے جو دہائیوں کی ناانصافی سے پیدا ہوئی ہے۔ حل گولی میں نہیں، 'سماعت' میں ہے۔ جس دن اسلام آباد نے ہمیں 'رعایا' کے بجائے 'برابر کا شہری' سمجھ کر ہماری بات سن لی، اس دن یہ بندوقیں خود بخود خاموش ہو جائیں گی۔ مگر جب تک آپ 'ترقی' کا نام لے کر 'قبضہ' کریں گے، یہ نوجوان پہاڑوں سے نیچے نہیں آئیں گے۔" اس نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ میری نوٹ بک کی طرف اشارہ کیا اور گرج کر کہا:
"جائیے! جا کر اپنے اخبار میں لکھ دیجیے کہ مہر اللہ کہتا ہے کہ 'ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو وہ قانون نہیں مانتا، وہ پھر صرف بدلہ مانتا ہے'۔ آپ ہم سے ہتھیار گرانے کا مطالبہ کرتے ہیں، مگر ان سے 'انصاف' کی بھیک مانگنے کی ہمت نہیں رکھتے جو اس آگ کے ذمہ دار ہیں۔ یاد رکھیے گا ذیشان صاحب! اگر ریاست باپ ہوتی ہے، تو باپ کبھی اپنے ہی بچوں کی قبروں پر 'ترقی کے مینار' کھڑے نہیں کرتا۔"
جب تک آپ 'انصاف' کے بجائے 'آپریشن' کریں گے، یہ آگ نہیں بجھے گی۔"آپ کے لیے یہ ایک 'سیکیورٹی رسک' ہے، مگر اس مٹی کے لیے یہ ایک 'مقدمہ' ہے۔ اب فیصلہ ریاست کو کرنا ہے کہ وہ ہمیں 'قبرستان کی خاموشی' دینا چاہتی ہے یا 'برابر کا وقار'۔"
سردار صاحب! آپ کی باتیں اپنی جگہ، مگر میرا ایک سوال ان عام لوگوں کے بارے میں ہے جو اس لڑائی کا حصہ نہیں ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ ایک بلوچ جب لاہور یا اسلام آباد جاتا ہے تو اسے 'خوش آمدید' کہا جاتا ہے، اسے محبت ملتی ہے، مگر جب ایک عام پنجابی بلوچستان کی زمین پر قدم رکھتا ہے تو اس کے دل میں خوف کیوں ہوتا ہے؟ وہ یہاں خود کو غیر محفوظ کیوں محسوس کرتا ہے؟ ایک مزدور، ایک استاد یا ایک عام شہری کو یہاں کیوں نشانہ بنایا جاتا ہے؟ اس مٹی پر یہ 'خوف اور ہراس' کس نے پھیلایا اور اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ کیا یہ آپ جیسے سرداروں کی ناکامی نہیں کہ آپ اپنے مہمان کو تحفظ نہیں دے سکے؟"
"ذیشان صاحب! آپ نے کڑوا سوال کیا ہے، تو جواب بھی کڑوا ہی سنیں۔ آپ پنجاب کی جس مہمان نوازی کا ذکر کر رہے ہیں، اسے محبت کا نام نہ دیں۔ وہاں بلوچ کو تب تک گلے لگایا جاتا ہے جب تک وہ خاموش رہے یا شکریہ ادا کرتا رہے۔ جس دن وہ اپنے وسائل کا حساب مانگتا ہے، اسی دن آپ کے ایوانوں کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ آپ کو

وہاں محبت ملتی ہوگی، ہمیں صرف 'رعایت' ملتی ہے، اور رعایت کبھی برابری کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔
رہی بات پنجابیوں کے یہاں خوف کی... تو یہ بیانیہ اس نظام نے پیدا کیا ہے جس نے پنجاب کو 'ریاست' کی علامت بنا کر پیش کیا۔ جب یہاں کا نوجوان دیکھتا ہے کہ اس کے وسائل پر فیصلے کرنے والا، اس پر گولی چلانے کا حکم دینے والا اور اس کی زمین پر قابض ہونے والا... سب پنجاب سے ہیں، تو وہ پھر ایک عام مزدور اور افسر میں فرق کرنا بھول جاتا ہے۔ اسے ہر پنجابی چہرے میں وہی نظام نظر آتا ہے جس نے اسے محروم رکھا۔
یہ اس طرزِ حکومت کی ذمہ داری ہے جس نے پنجاب کو 'ریاست' اور بلوچستان کو 'کالونی' بنا کر رکھا۔ جب آپ ایک قوم کو دیوار سے لگا دیں گے، تو وہ اس ہر چہرے سے نفرت کرنے لگے گی جو اس دیوار کی یاد دلاتا ہو۔ مجھے دکھ ہے کہ یہاں معصوم مزدور مارے جاتے ہیں، کیونکہ بلوچ
بلوچ تو مہمان نواز ہے، بلوچ
کی روایت تو دشمن کو بھی پناہ دینا ہے، مگر یہ بندوق اب کسی سردار کے بس میں نہیں، یہ اس 'انتقام' کے قبضے میں ہے جسے آپ کے نظام نے خود جنم دیا ہے۔ آپ نے ہمیں بھائی نہیں، غلام سمجھا... اور غلام کبھی اپنے آقا کے ہم قوم سے محبت نہیں کر سکتا۔

"سردار صاحب! آپ کا یہ کہنا کہ 'عام پنجابی چہرے میں نظام نظر آتا ہے'، کیا یہ ایک کمزور دلیل نہیں؟ جب نوشکی یا مستونگ کی سڑک پر کسی غریب مزدور کو بس سے اتار کر اس کا شناختی کارڈ دیکھ کر گولی ماری جاتی ہے، تو کیا اس وقت اس کے ہاتھ کی لکیریں یہ نہیں بتاتیں کہ وہ بھی آپ کے بلوچ چرواہے کی طرح ایک محنت کش ہے؟ وہ وہاں کوئی 'فیصلہ' کرنے نہیں، بلکہ اپنے بچوں کی دو وقت کی روٹی کمانے آتا ہے۔"
"آپ اسے ریاست کی علامت کہتے ہیں، مگر وہ تو صرف غربت کا مارا ہوا ایک انسان ہوتا ہے۔ دوسری طرف، جب ایک بلوچ نوجوان لاہور کی منڈی میں مزدوری کرتا ہے یا اسلام آباد کی کسی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے، تو کوئی اس کا شناختی کارڈ دیکھ کر اسے گولی نہیں مارتا۔ کیا آپ کی 'بلوچ روایت' اب اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ وہ ایک نہتے مہمان اور ایک مسلح دشمن میں فرق کرنا بھول گئی ہے؟ کیا اس خونِ ناحق کی ذمہ داری سے آپ کا یہ 'مقدمہ' داغدار نہیں ہو رہا؟"
سردار مہر اللہ نے تسبیح اپنی مٹھی میں بھینچ لی اور اس کی آنکھیں شیشے کی طرح ساکت ہو گئیں۔ اس نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے وہ میرے سوال کی معصومیت پر ماتم کر رہا ہو۔ "ذیشان صاحب! آپ کے پاس 'منطق' ہے، مگر میرے پاس 'منظر' ہے۔ آپ جس مزدور کی بات کر رہے ہیں، اس کا قتل ایک ظلم ہے، ایک گناہ ہے، اور میں اس کا دفاع نہیں کروں گا، مگر آپ جو موازنہ کر رہے ہیں کہ 'لاہور میں بلوچ کو کوئی نہیں مارتا'، وہ موازنہ ہی غلط ہے۔"

وہ تھوڑا اور آگے جھکا، اس کی آواز میں اب گونج پیدا ہو گئی: "لاہور میں بلوچ ایک 'مہمان' یا 'مانگنے والا' بن کر جاتا ہے۔ وہ وہاں کے وسائل پر حق نہیں جتاتا، وہ وہاں کی زمین کا مالک بننے کا دعویٰ نہیں کرتا، اس لیے وہ آپ کے لیے خطرہ نہیں بلکہ صرف ایک 'فرد' ہے۔ لیکن جب ایک غیر مقامی یہاں آتا ہے، تو وہ ان سڑکوں پر آتا ہے جہاں سے پہلے ہمارے نوجوانوں کو اٹھایا گیا ہوتا ہے۔ وہ ان منصوبوں کا حصہ بن کر آتا ہے جن سے بلوچ کو بے دخل کیا گیا ہے۔ آپ اسے ایک 'غریب مزدور' دیکھتے ہیں، مگر پہاڑوں پر بیٹھے اس نوجوان کو، جس نے اپنے بھائی کی مسخ شدہ لاش اٹھائی ہو، اس مزدور کے ہاتھ میں وہ ہتھوڑا اوزار نہیں لگتا، بلکہ اپنی زمین کی تقسیم کی وہ 'کیلیں' نظر آتا ہے جو اس کے قبضے کو مضبوط کر رہی ہیں۔"

سردار نے ایک سرد آہ بھری اور بات جاری رکھی:

"آپ کہتے ہیں وہ بھی مزدور ہے، میں بھی مانتا ہوں کہ وہ غریب ہے، مگر مسئلہ اس کی غربی کا نہیں بلکہ اس کی 'پہچان' کا ہے۔ وہ اس گروہ کا حصہ بن کر یہاں کھڑا ہوتا ہے جسے ریاست 'ترقی کا چہرہ' کہتی ہے اور ہمیں 'رکاوٹ'۔ یہاں جنگ 'مزدوروں' کے درمیان نہیں، بلکہ 'مالک' اور 'مداخلت' کے درمیان ہے۔ جب تک ریاست کا رویہ یہاں ایک 'غاصب' جیسا رہے گا، یہاں آنے والا ہر شخص—چاہے وہ کتنا ہی مجبور کیوں نہ ہو—اسے اس قبضے کا ایک مہرہ ہی سمجھا جائے گا۔"

اس کے لہجے میں اب تلخی اور بھی بڑھ گئی:

"لاہور میں آپ کو ہم سے ڈر اس لیے نہیں لگتا کیونکہ وہاں آپ 'مالک' ہیں اور ہم 'محتاج'، مگر یہاں ہم اپنے گھر میں بھی خود کو 'محتاج' محسوس کرتے ہیں، اور یہی وہ غصہ ہے جو بے گناہ اور گناہ گار کی تمیز مٹا دیتا ہے۔ جب ریاست کی بندوق بلوچ کے گھر میں داخل ہوتی ہے، تو وہ یہ نہیں دیکھتی کہ اس گھر میں موجود عورت یا بچے کا ریاست کی پالیسیوں سے کیا تعلق ہے، وہ بس 'بلوچ' ہونے کی سزا پاتے ہیں۔ یہی زہر اب دوسری طرف بھی پھیل چکا ہے۔"

آخر میں اس نے تسبیح چھوڑ دی اور میری آنکھوں میں دیکھ کر آخری ضرب لگائی:

رہی بات بلوچ روایت کی... تو ذیشان صاحب! جب جنگ چھڑتی ہے تو روایتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ 'انتقام' ایک اندھا جانور ہے، اسے یہ نظر نہیں آتا کہ سامنے والا کتنا غریب ہے۔ اسے صرف یہ نظر آتا ہے کہ اس کا تعلق اس گروہ سے ہے جس نے اس کی نسل کشی کی۔"

سردار صاحب! کیا میں یہ سمجھوں کہ اب آپ کی آواز اپنے ہی لوگوں کے لیے بے اثر ہو چکی ہے؟ اگر کل ریاست مذاکرات کرنا چاہے، تو کیا پہاڑوں پر بیٹھے وہ نوجوان آپ کی بات مانیں گے یا آپ بھی ان کے لیے 'نظام کا حصہ' بن چکے ہیں؟"

سردار مہر اللہ نے تسبیح روک لی اور کھڑکی سے باہر پھیلے سنگلاخ پہاڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے نحیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا:

"ذیشان صاحب! جب تک میں ان کے حق کی بات کروں گا، میں ان کا 'سردار' ہوں۔ جس دن میں نے ان کے زخموں کا سودا کیا، میں ان کے لیے 'ریاست کا مہرہ' بن جاؤں گا۔"

وہ تھوڑا رکا اور پھر میری آنکھوں میں دیکھ کر کہا:

"آپ مذاکرات کی بات کرتے ہیں؟ میاں! مذاکرات ان سے ہوتے ہیں جن پر اعتبار ہو۔ یہاں مسئلہ میری آواز کا نہیں، اسلام آباد کی 'سچائی' کا ہے۔ وہ نوجوان میری بات تب سنیں گے جب انہیں لگے گا کہ میری زبان کے پیچھے ریاست کا کوئی نیا دھوکہ نہیں، بلکہ سچا انصاف کھڑا ہے۔ آج وہ میری عزت کرتے ہیں، مگر کل کا فیصلہ ان کے دکھ کریں گے، میرا حکم نہیں۔" یاد رکھیے گا، میں ان کے سروں کا سردار تو ہو سکتا ہوں، ان کے 'دکھوں' کا نہیں! ان کے دکھ آزاد ہیں، اور وہ اپنا راستہ خود چن رہے ہیں۔

سردار صاحب! آپ کے لوگ اور یہ تحریکیں اکثر نعرہ لگاتی ہیں کہ 'فوج بلوچستان سے نکل جائے'۔ مگر ایک لمحے کو حقیقت پسندی سے سوچیں، اگر آج فوج یہاں سے نکل جائے تو کیا یہاں 'خانہ جنگی'(Civil War) شروع نہیں ہو جائے گی؟ کیا مختلف سردار اور مسلح گروہ ایک دوسرے کے دست و گریبان نہیں ہو جائیں گے؟ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ فوج کی موجودگی یہاں کم از کم ایک 'ریاستی ڈھانچے' کو برقرار رکھے ہوئے ہے، ورنہ یہاں صرف انارکی ہو گی؟"

سردار نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور بہت مختصر جواب دیا:

"ذیشان صاحب! آپ 'خانہ جنگی' کا ڈر سنا کر ہمیں اس 'خاموش موت' پر راضی کرنا چاہتے ہیں جو اس وقت ہمیں درپیش ہے؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمیں سیکیورٹی نہیں چاہیے، ہم کہتے ہیں کہ ہمیں 'کیمپ' نہیں، 'کمیونٹی' چاہیے۔"

وہ تھوڑا اور قریب ہوا اور دھیمی آواز میں بولا:

"جب فوج کا کام سرحدوں کی حفاظت کے بجائے گلیوں کی نگرانی اور سیاست کے فیصلے کرنا بن جائے، تو وہ سیکیورٹی نہیں 'خوف' بن جاتی ہے۔ آپ جس انارکی کی بات کر رہے ہیں، وہ تو اس بندوق کے سائے میں بھی موجود ہے۔ حل فوج کا ہونا یا نہ ہونا نہیں، حل اس کا 'اپنے دائرے' میں ہونا ہے۔ جب تک آپ یہاں کے ہر سویلین مسئلے کا حل 'بوٹ' کے نیچے ڈھونڈیں گے، یہاں یہ نعرے لگتے رہیں گے۔ ہمیں سیکیورٹی چاہیے، مگر کسی 'محکوم' کی طرح نہیں، ایک 'شہری' کی طرح۔"

سردار صاحب! ہم نے کافی دیر بات کی، آپ نے ریاست کو کٹہرے میں کھڑا کیا، پنجاب سے گلے کیے اور نوجوانوں

کے غصے کو جائز قرار دیا۔ مگر کیا آپ کے پاس ان قبروں اور مسخ شدہ لاشوں کے علاوہ کوئی اور 'حل' بھی ہے؟ اگر آج اسلام آباد آپ کو میز پر بلا کر کہے کہ 'سردار صاحب، یہ لیجیے قلم اور بتائیے کہ ہم کیا کریں کہ کل سے خون بہنا بند ہو جائے'، تو کیا آپ کے پاس کوئی ایسا نقشہ ہے جو صرف نعروں تک محدود نہ ہو؟ یا آپ کا مقدمہ صرف 'احتجاج' تک ہے اور آپ کے پاس اپنے لوگوں کو دینے کے لیے سوائے 'انتقام کے بیانیے' کے اور کچھ نہیں؟"

سردار مہر اللہ ایک لمحے کے لیے بالکل ساکت ہو گیا، جیسے اس سوال نے اس کے قلعے کی دیواروں میں دراڑ ڈال دی ہو اور پھر دبے لہجے میں بولا

ذیشان صاحب! اگر آج وہ قلم میرے ہاتھ میں ہو، تو میرا پہلا جملہ 'ترقی' نہیں 'اعتماد' ہو گا۔ حل سڑکوں اور پلوں میں نہیں، 'سچ' میں چھپا ہے۔"

پہلا حل: ان ماؤں کو ان کے بیٹے لوٹا دیں جن کی آنکھیں چوکھٹ پر پتھرا چکی ہیں۔ چاہے وہ زنداں میں ہوں یا مٹی تلے، انہیں جواب دے دیں تاکہ یہ 'نامعلومی' کا عذاب ختم ہو۔"

دوسرا حل: اس مٹی کے وسائل کا پہلا حق اس کے وارث کا لکھ دیں۔ جب بلوچ کو لگے گا
کہ گوادر کی لہریں اور پہاڑوں کا سونا اس کے بچوں کا مستقبل سنوار رہا ہے، تو وہ بندوق خود توڑ دے گا۔"

"تیسرا اور آخری حل: ہمیں 'رعایا' سمجھنا چھوڑ دیں اور ہمیں 'شراکت دار' مان لیں۔ جب تک آپ یہاں کے فیصلے بند کمروں میں بیٹھ کر کریں گے، یہاں آگ لگی رہے گی۔ جس دن اسلام آباد نے بلوچستان کا مقدمہ 'سیکیورٹی' کے بجائے 'سیاست اور عزت' کے آئینے میں دیکھا، اس دن آپ کو کسی سردار کی ضمانت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

وہ سیدھا ہو کر بیٹھا اور تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولا: "حل موجود ہے ذیشان صاحب، مگر حل کے لیے 'انا' قربان کرنی پڑتی ہے، اور بدقسمتی سے اس ملک میں سونا سستا ہے اور انا بہت مہنگی۔"

سردار صاحب! میں نے آپ کا پورا مقدمہ سن لیا۔ میں یہاں سے آپ کی باتیں، آپ کے شکوے اور آپ کے یہ تلخ جوابات لے کر واپس جا رہا ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ سب ویسا ہی لکھوں جیسا میں نے سنا ہے، تاکہ لاہور اور اسلام آباد میں بیٹھے لوگ آپ کے اس درد کو سمجھ سکیں جو ان پہاڑوں کی خاموشی میں چھپا ہے۔"

سردار مہر اللہ نے اپنی تسبیح مٹھی میں دبوائی، وہ اٹھا اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا جہاں سے نوشکی کے سنگلاخ پہاڑ اب اندھیرے میں ڈوب رہے تھے۔ اس نے مڑ کر میری آنکھوں میں دیکھا اور نہایت سرد لہجے میں کہا:

"جائیے! لاہور جا کر انہیں بتائیے کہ بلوچستان اب صرف 'مقدمہ' نہیں رہا، یہ ایک 'زخم' بن چکا ہے جسے مرہم کی نہیں، 'عدل' کی ضرورت ہے۔ اگر آج بھی انصاف نہ ہوا، تو کل تاریخ کے پاس گواہی دینے کے لیے صرف راکھ بچے گی۔"

سردار مہر اللہ کے آخری جملے کی گونج ابھی کمرے میں باقی تھی کہ اس نے اپنی تسبیح جیب میں ڈالی اور ایک گہرا سانس لے کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر موجود وہ جنگجوانہ سختی اب ایک مدھم سی نرمی میں بدل چکی تھی۔ "ذیشان صاحب! 'مقدمہ' بہت طویل ہے اور شام ڈھل چکی ہے۔ نوشکی کی راتیں مسافروں کے لیے اجنبی ہوتی ہیں، اور آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آج کی رات آپ یہیں ہمارے ڈیرے پر قیام کریں گے۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا: "اعتراض مت کیجیے گا، یہ ہماری روایت ہے۔ اگر آپ کو صبح جلدی جانا ہے تو ہماری گاڑیاں آپ کو بحفاظت چھوڑ آئیں گی، مگر آج کا نمکین گوشت اور قہوہ آپ کو ہمارے ساتھ پینا ہوگا۔" میں انکار نہ کر سکا، اور سچ تو یہ ہے کہ ان سنگلاخ پہاڑوں کے بیچ اس قلعہ نما ڈیرے میں ایک رات گزارنا میرے لیے اس 'مقدمے' کو سمجھنے کا ایک اور موقع تھا۔ کھانے کی میز پر وہی سردار مہر اللہ جو تھوڑی دیر پہلے ریاست کے خلاف آگ اگل رہا تھا، اب ایک نہایت شفیق میزبان تھا۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے میرے سامنے لذیذ 'سجی' اور 'روغنی روٹی' رکھی۔ وہاں اب کوئی سیاسی بحث نہیں تھی، صرف بلوچ روایات، ان کے پرانے قصے اور شکار کی باتیں تھیں۔ اس دسترخوان پر مجھے احساس ہوا کہ بلوچ کی دشمنی جتنی گہری ہے، اس کی مہمان نوازی اتنی ہی وسیع ہے۔ وہ اپنے دشمن کا پیٹ بھی خالی نہیں رہنے دیتا، اور یہ وہ تضاد تھا جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔

رات گئے جب مجھے اور شاہ میر کو ہمارے کمرے میں منتقل کیا گیا، تو وہاں کی سادہ مگر پرسکون فضا میں ایک عجیب سا سکون تھا۔ شاہ میر دوسرے بستر پر لیٹتے ہی میری طرف مڑا اور دھیمی آواز میں پوچھا، "ذیشان بھائی! اندر آپ کی سردار سے کیا کیا باتیں ہوئیں؟

میں نے اپنا لیپ ٹاپ میز پر رکھا اور ایک گہرا سانس لے کر اسے مختصر بتانے لگا: "شاہ میر! سردار نے آج وہ سب کچھ کہہ دیا جو شاید ایک عام بلوچ کے دل میں چھپا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ ریاست سے دشمنی نہیں رکھتا، بلکہ اس 'بے اعتباری' اور 'ناانصافی' سے لڑ رہا ہے جس نے اسے اپنے ہی گھر میں کرائے دار بنا دیا ہے۔ اس نے وسائل پر اختیار، لاپتہ افراد کا دکھ اور اس 'انا' کی بات کی جو اسلام آباد اور بلوچستان کے درمیان دیوار بن چکی ہے۔ اس نے یہ بھی مانا کہ انتقام ایک اندھا جانور ہے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ جب تک عدل نہیں ہوگا، یہاں صرف راکھ بچے گی۔" شاہ میر یہ سب سن کر خاموش ہو گیا، جیسے وہ ان لفظوں کا بوجھ محسوس کر رہا ہو۔ میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ کھڑکی سے باہر چاند کی روشنی میں نوشکی کے پہاڑ چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ میری نیند کوسوں

دور تھی۔ میرے ذہن میں سردار کے وہ دو مختلف روپ گھوم رہے تھے۔ ایک وہ جو اپنے حقوق کے لیے 'راکھ' بن جانے کی بات کرتا تھا، اور ایک وہ جو تھوڑی دیر پہلے دسترخوان پر اپنے مہمان کے آرام کے لیے خود اٹھ کر پانی پیش کر رہا تھا۔ میں نے سوچا، جس قوم کی روایت اتنی مضبوط ہو کہ وہ اپنے نظریاتی مخالف کو بھی سر آنکھوں پر بٹھائے، اسے 'باغی' بنا دینا کسی بڑے المیہ سے کم نہیں۔

صبح سویرے جب ابھی سورج نے پہاڑوں کی اوٹ سے پوری طرح سر نہیں نکالا تھا، میرے کمرے کے لکڑی کے بھاری دروازے پر دستک ہوئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا، شاہ میر بھی اپنی نیند سے جاگ چکا تھا۔ دروازہ کھولا تو سامنے کاکا جمعہ کھڑے تھے، ان کے ہاتھ میں ایک سفید لفافہ تھا۔

"ذیشان بیٹا، جاگ گئے؟" کاکا جمعہ کے لہجے میں ایک عجیب سی سنجیدگی تھی۔ "سردار صاحب فجر کے وقت ہی نکل گئے تھے، مگر جاتے ہوئے یہ لفافہ خاص طور پر تمہارے لیے چھوڑ کر گئے ہیں۔"

میں نے حیرت سے لفافہ تھام لیا۔ شاہ میر بستر سے اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ جیسے ہی میں نے لفافہ کھولا، اس میں سے ایک چھوٹی سی پرچی نکلی جس پر صرف ایک نام اور ایک مقام لکھا تھا۔ سردار امیر خان بلوچ — خاران۔ میں نے سوالیہ نظروں سے کاکا جمعہ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائے اور بولے، "بیٹا! سردار مہر اللہ کو تمہارا انداز بہت پسند آیا ہے۔ وہ عام طور پر لاہور سے آنے والوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتے، مگر تمہارے سوالوں نے ان کے دل میں ایک نرم گوشہ پیدا کر دیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ اگر تم واقعی بلوچستان کا 'اندرونی زخم' دیکھنا چاہتے ہو، تو تمہیں خاران کے سردار امیر خان سے ملنا چاہیے۔" کاکا جمعہ نے مزید بات کو اگے بڑھاتے ہوئے کہا

مہر اللہ کے پاس 'درد' ہے، اس لیے وہ پکارتا ہے، فریاد کرتا ہے۔ مگر خاران کا امیر خان اس درد سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ مہر اللہ آپ کو بتائے گا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا، مگر امیر خان آپ کو یہ دکھائے گا کہ اب کیا 'ہونے والا' ہے۔ اس کا نام ہی اس کی شخصیت ہے — وہ اپنے فیصلوں کا امیر ہے اور اپنی خاموشی کا بادشاہ۔"

وہ تھوڑا اور قریب ہوئے اور آواز نیچی کر لی:
"امیر خان وہ شخص ہے جس نے پچھلے کئی برسوں سے کسی سرکاری اہلکار کو اپنے ڈیرے کی دہلیز پار نہیں کرنے دی۔ وہ مہر اللہ کی طرح بحث نہیں کرتا، وہ صرف ایک جملہ کہتا ہے اور وہ جملہ پتھر کی لکیر بن جاتا ہے۔ مہر اللہ نے تمہیں

اس کے پاس اس لیے بھیجا ہے تاکہ تم جان سکو کہ جب کوئی قوم بولنا چھوڑ دے، تو اس کا مطلب 'خاموشی' نہیں بلکہ 'طوفان سے پہلے کا سکون' ہوتا ہے۔"

شاہ میر، جو اب تک خاموشی سے سن رہا تھا، اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ "کاکا! اگر وہ اتنا ہی سخت ہے تو وہ ہمیں کیوں ملے گا؟" کاکا مسکرائے، "وہ تمہیں اس لیے ملے گا کیونکہ تمہارے ہاتھ میں مہر اللہ کی یہ پرچی ہے۔ سردار امیر خان ہر کسی کے لیے نہیں کھلتا، مگر وہ مہر اللہ کے 'اعتبار' کو کبھی رد نہیں کرے گا۔" میں نے وہ پرچی اپنی نوٹ بک کے اندر اس طرح رکھی جیسے کوئی قیمتی دستاویز ہو۔ اب مجھے سمجھ آ رہا تھا کہ میرا یہ سفر اب محض ایک صحافی کی رپورٹنگ نہیں رہا، بلکہ یہ ایک ایسی تپتی ہوئی سڑک ہے جو مجھے اس سچ کی طرف لے جا رہی ہے جسے ہم لاہور میں بیٹھ کر 'افسانہ' سمجھتے تھے۔ میں نے کاکا جمعہ کی طرف دیکھا اور پوچھا، "کاکا، راستہ بڑا کٹھن ہے اور سنا ہے خاران کی سمت حالات بھی ٹھیک نہیں، ہم وہاں تک پہنچیں گے کیسے؟ کوئی سواری یا کوئی ذریعہ؟" کاکا جمعہ نے اطمینان سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر بولے، "بیٹا، اس کی پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ سردار صاحب نے سب انتظام کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک خاص اور بھروسہ مند ڈرائیور کو کہہ دیا ہے، وہ اپنی ہی جیپ میں تم دونوں کو لے کر جائے گا اور سیدھا سردار امیر خان کے ڈیرے تک پہنچا دے گا۔ سردار کی جیپ پر ہونا ہی تمہاری سب سے بڑی سکیورٹی ہے۔" کاکا جمعہ کی بات سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ سردار مہر اللہ نے مجھے صرف ایک انٹرویو نہیں دیا تھا، بلکہ اس 'مقدمے' کی اگلی کڑی تک پہنچنے کا راستہ بھی دے دیا تھا۔ ہم دوبارہ سردار کے اسی وسیع ڈیرے کے دالان میں آئے جہاں دسترخوان بچھ چکا تھا۔ سردار کے ملازموں نے ہمارے لیے وہیں ناشتہ لگا دیا۔ گرم گرم پراٹھے، تازہ مکھن اور لسی کے بڑے بڑے گلاسوں نے ہماری تھکن اتار دی، مگر میرے ذہن میں ابھی بھی خاران کے اس 'خاموش سردار' کا نقشہ بن رہا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم باہر آئے تو وہی مضبوط جیپ اسٹارٹ کھڑی تھی، جس کا انجن ایک خاص گھمبیر آواز پیدا کر رہا تھا۔ ڈرائیور، جس کے چہرے کی جھریاں اس راستے کی سختیوں کی گواہ تھیں، اسٹیئرنگ سنبھالے خاموشی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ میں، شاہ میر اور ڈرائیور، ہم تینوں جیپ میں سوار ہوئے اور جیسے ہی گاڑی نے رفتار پکڑی، ڈیرے کا بھاری لکڑی کا گیٹ پیچھے رہ گیا اور ہمارے سامنے دھول اڑاتی وہ سڑک شروع ہو گئی جو ہمیں اس انجانے سچ کی طرف لے جا رہی تھی جس کا نام 'سردار امیر خان' تھا۔

جیپ نوشکی کی آباد بستیوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی اب اس لکیر پر دوڑ رہی تھی جہاں سے زندگی کے نشان مٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ شاہ میر نے کھڑکی سے باہر پھیلی لامتناہی ویرانی کو دیکھ کر ایک لمبا سانس لیا اور اپنی سیٹ پر تھوڑا اور سمٹ گیا۔ باہر کا درجہ حرارت تیزی سے بڑھ رہا تھا اور جیپ کے پہیوں تلے دبنے والی بجری کی آواز کسی پرانے زخم کے

چھیلے جانے جیسی تھی۔ خاران کا یہ راستہ محض ایک جغرافیائی مسافت نہیں تھی، بلکہ یہ اس 'خاموشی' کا دیباچہ تھا جس کا ذکر کاکا جمعہ نے کیا تھا۔ ڈرائیور کی آنکھیں سامنے پھیلی دھندلی سڑک پر جمی تھیں، مگر وہ ایک لفظ بھی نہیں بول رہا تھا، جیسے اسے بولنے کی ممانعت ہو یا شاید ان سنگلاخ پہاڑوں نے اس کی زبان سے لفظ چھین لیے ہوں۔

تھوڑی دور جانے کے بعد، ریگستان کی تپتی ہوا نے جیپ کے اندر داخل ہونا شروع کر دیا، جس میں ریت کی ہلکی سی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ شاہ میر نے خاموشی توڑی، "ذیشان بھائی، یہ راستہ تو کبھی ختم ہونے والا نہیں لگ رہا۔ ایسا لگتا ہے ہم کسی ایسی دنیا میں جا رہے ہیں جہاں قانون نہیں، صرف وقت کی گرد حکمرانی کرتی ہے۔" میں نے اسے تسلی دینے کے لیے مسکرانے کی کوشش کی، مگر سچ تو یہ تھا کہ میرے اپنے اندر بھی ایک عجیب سی بے چینی جنم لے رہی تھی۔ دور افق پر اٹھتا ہوا غبار کسی ان دیکھے طوفان کا پتہ دے رہا تھا۔اچانک ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار کم کی اور جیپ ایک سنسان موڑ پر رک گئی۔ سامنے ایک پرانی، زنگ آلود چیک پوسٹ تھی جہاں کلاشنکوف تھامے دو نوجوان کھڑے تھے جن کے چہروں پر ڈھکے ہوئے مفلروں نے انہیں مزید پراسرار بنا دیا تھا۔ میرے اور شاہ میر کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا، مگر ڈرائیور نے بغیر کچھ کہے صرف جیپ کا ہارن بجایا اور کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا۔ ان نوجوانوں نے جیسے ہی جیپ کا نمبر اور ڈرائیور کو پہچانا، ان کے سخت تیور ڈھیلے پڑ گئے اور انہوں نے خاموشی سے راستہ دے دیا۔ ڈرائیور نے میری طرف دیکھے بغیر دھیمی آواز میں صرف اتنا کہا، "اب ہم سردار امیر خان کی عملداری میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہاں سے آگے سڑک نہیں، صرف تقدیر چلتی ہے۔"

جیپ اب ایک ایسی وادی میں داخل ہو رہی تھی جہاں پہاڑوں کا رنگ سیاہ تھا اور زمین بالکل بنجر۔ بستیوں کا نام و نشان مٹ چکا تھا، بس کہیں کہیں ایک آدھ جھونپڑی نظر آتی جس کی چھت پر لکڑیاں اور گھاس پھونس پڑی ہوتی۔ وہاں موجود بچے جیپ کی آواز سن کر باہر نکلتے اور گرد میں اٹی اپنی معصوم آنکھوں سے ہمیں ایسے دیکھتے جیسے ہم کسی دوسری دنیا کے مسافر ہوں۔ ان کے پاؤں ننگے تھے اور چہرے دھوپ سے جھلسے ہوئے، مگر ان کی خاموشی میں ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب لاہور کے کسی ایوان میں موجود نہیں تھا۔

جیپ جیسے ہی ڈیرے کے بھاری لکڑی کے دروازے پر رکی، وہاں موجود کلاشنکوف بردار گارڈز نے ڈرائیور سے ہاتھ ملایا۔ ڈرائیور نے سردار مہر اللہ کا حوالہ دیا اور وہ پرچی دکھائی۔ ایک گارڈ اندر گیا اور کچھ ہی دیر بعد ایک معمر شخص، جو غالباً ڈیرے کا کارندہ یا 'خاص ملازم' تھا، باہر آیا۔ اس نے بڑے ادب سے ہمیں 'سلام دعا' کہی اور اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم ایک وسیع دالان سے گزرتے ہوئے ایک بڑے کمرے (دیوان عام) میں داخل ہوئے جہاں فرش پر قیمتی

بلوچی قالین بچھے تھے اور دیواروں پر پرانی تلواریں اور ڈھالیں لگی تھیں۔ ملازم نے ہمیں بٹھایا اور بلوچی روایت کے مطابق سب سے پہلے 'حال احوال' پوچھا۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ دو ملازم بڑے پیتل کے تھالوں میں تازہ کھجوریں اور ٹھنڈا لسی کا گلاس لے کر آئے۔ یہ بلوچستان کی وہ روایت ہے کہ مہمان چاہے دشمن ہی کیوں نہ ہو، اسے خالی پیٹ بات نہیں کرنے دی جاتی۔ لسی کے اس ٹھنڈے گلاس اور تازہ کھجوروں نے ہمارے سفر کی تھکن تو اتار دی، مگر کمرے میں چھائی پراسرار خاموشی ہمارے اعصاب پر سوار تھی۔ ہم نے ابھی لسی ختم ہی کی تھی کہ تقریباً پانچ منٹ بعد سامنے والا بھاری ریشمی پردہ ہٹا اور سردار امیر خان کمرے میں داخل ہوئے۔ان کی آمد کے ساتھ ہی کمرے کے درجہ حرارت میں ایک عجیب سی تپش محسوس ہوئی۔ میں اور شاہ میر فوراً اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے۔ سردار نے نہایت وقار کے ساتھ ہاتھ آگے بڑھایا، ان کی گرفت اتنی ہی سخت تھی جتنا ان کا نام۔ روایتی بلوچی انداز میں حال احوال ہوا، مگر ان کے لہجے میں کوئی جذباتی گرم جوشی نہیں تھی، بلکہ ایک سرد مہری تھی۔ وہ اپنی مخصوص مسند پر بیٹھ گئے اور ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے جیب سے وہ پرچی نکالی اور ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، "سردار صاحب! مہر اللہ صاحب کا پیغام لے کر آیا ہوں، انہوں نے کہا تھا کہ اگر میں 'درد' سے آگے کا حال دیکھنا چاہوں تو آپ کی چوکھٹ پر دستک دوں۔"

سردار امیر خان نے پرچی پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر اس طرح دیکھا جیسے وہ میری روح کے پار دیکھ رہے ہوں۔ انہوں نے نہایت دھیمی مگر کاٹ دار آواز میں پوچھا:

"مہر اللہ تو بہت کچھ بولتا ہے... آپ کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟" میں نے نوٹ بک نکالی اور پہلا سوال کیا

"سردار صاحب! کیا یہ سرداری نظام بلوچ عوام کے گلے میں وہ طوق نہیں جو انہیں جدید دنیا سے پیچھے رکھے ہوئے ہے؟"

سردار: "جدید دنیا کا طوق پہننے سے بہتر ہے کہ انسان اپنی مٹی کی زنجیر میں آزاد رہے۔"

. ذیشان: "آپ تعلیم کی بات کرتے ہیں، مگر کیا آپ نے خود اسکولوں کو اپنے ڈیروں کے اصطبل میں تبدیل نہیں کیا؟"

سردار: "ریاست نے اسکولوں کو جاسوسی کے اڈے بنایا، ہم نے انہیں مٹی کی پناہ گاہ رہنے دیا۔"

ذیشان: "سردار صاحب! کیا یہ سچ نہیں کہ آپ جیسے سردار ہی بلوچستان کی پسماندگی کے اصل ذمہ دار ہیں؟"

سردار: "سردار تو مٹی کا پہرے دار تھا، اسے 'بیساکھی' ریاست نے فراہم کی۔"

ذیشان: "فوج یہاں اپنی جان دے کر امن لا رہی ہے، آپ اسے 'غاصب' کیوں کہتے ہیں؟"

سردار: "امن وہ ہوتا ہے جو دلوں میں اترے، وہ نہیں جو بوٹوں کی چاپ سے گلیوں میں پھیلے۔"

ذیشان: "آپ جیسے لوگ دہشت گردوں کو پناہ دیتے ہیں اور پھر گلہ کرتے ہیں کہ آپریشن کیوں ہوا؟"

سردار: "جب ریاست اپنے ہی شہریوں کو 'دہشت گرد' لکھ کر فائل بند کر دے، تو پناہ گھر نہیں، پہاڑ دیتے ہیں۔"
ذیشان: "اگر فوج یہاں سے چلی جائے تو کیا آپ کے مسلح گروہ ایک دوسرے کا خون نہیں بہائیں گے؟"
سردار: "ہم اپنے خون کا حساب خود کر لیں گے، ہمیں کسی 'کرائے کے منصف' کی ضرورت نہیں ہے۔"
ذیشان: "ریاست نے یہاں سڑکیں بنائیں، ہسپتال دیے، کیا یہ سب آپ کو نظر نہیں آتا؟"
سردار: "سڑکیں ہمارے معدنیات لے جانے کے لیے بنی ہیں، ہمارے مریضوں کو شہر پہنچانے کے لیے نہیں۔"
ذیشان: "ریاست نے آپ کو سینیٹ اور اسمبلیوں میں نمائندگی دی، کیا وہ سب آپ کی آواز بننے میں ناکام رہے؟"
سردار: "وہ ایوان تو 'گونگوں کی بستی' ہے جہاں صرف وہی سنا جاتا ہے جو اسلام آباد بولنا چاہتا ہے۔"
ذیشان: "اگر آپ کو اتنی ہی شکایت ہے تو یہ سبز پاسپورٹ اور مراعات کیوں رکھتے ہیں؟ پھینک کیوں نہیں دیتے؟"
سردار: "پاسپورٹ میری زمین کا ٹکٹ ہے، آپ کی دی ہوئی خیرات نہیں کہ واپس کر دوں۔"
ذیشان: "آپ کی ضد معصوم بلوچ نوجوانوں کو پہاڑوں پر بھیج کر ان کی زندگیاں برباد کر رہی ہے، اس گناہ کا ذمہ دار کون ہے؟"
سردار : "وہ نوجوان پہاڑوں پر شوق سے نہیں گئے، آپ کے نظام نے ان کے لیے زمین اتنی تنگ کر دی کہ ان کے پاس صرف 'آسمان' کی بلندی ہی باقی بچی۔"
ذیشان: " قانون کی حکمرانی تو ہر حال میں ہوگی، کیا آپ خود کو ریاست سے بالاتر سمجھتے ہیں؟"
سردار: " قانون وہ زنجیر ہے جو صرف ہماری گردنوں کے لیے بنی ہے، آپ کے بوٹوں کے لیے نہیں۔ جس دن آپ کا قانون اسلام آباد اور خاران کے لیے ایک ہو گیا، امیر خان خود سر جھکا دے گا۔"تب تک... میرا 'وقار' ہی میرا قانون ہے
ذیشان: "اگر کل ریاست آپ کو کچلنے کا فیصلہ کر لے، تو آپ کا اگلا قدم کیا ہوگا؟"
سردار: "دیوار سے لگے انسان کا اگلا قدم 'واپسی' نہیں، بلکہ 'حملہ' ہوتا ہے۔"
ذیشان: "آپ کے پاس ریاست کے مقابلے میں کیا ہے؟ چند پرانی بندوقیں اور کچھ ناراض نوجوان؟"
سردار: "ہمارے پاس وہ 'حق' ہے جو کبھی پرانا نہیں ہوتا، اور وہ 'مٹی' ہے جو کبھی غداری نہیں کرتی۔"
ذیشان: "آپ پنجابی مزدوروں کو نشانہ بنا کر کس قسم کی 'آزادی' کا خواب دیکھ رہے ہیں؟"
سردار: "ہم 'آزادی' نہیں مانگ رہے، ہم اس 'درد' کا جواب دے رہے ہیں جو ہمیں آپ کے نظام نے دیا ہے۔"
ذیشان: "کیا ایک عام پنجابی کا خون اتنا سستا ہے کہ آپ کے غصے کی بھینٹ چڑھ جائے؟"
سردار: "خون سب کا قیمتی ہے، مگر کیا کبھی آپ نے کسی 'بلوچ' کے خون پر بھی اتنا ہی واویلا کیا؟"
ذیشان: "کیا آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کا یہ مقدمہ اب 'دہشت گردی' کی شکل اختیار کر چکا ہے؟"

سردار: "طاقتور جب مارتا ہے تو وہ 'آپریشن' ہوتا ہے، کمزور جب تڑپتا ہے تو وہ 'دہشت گردی' کہلاتی ہے۔

ذیشان: "آپ تعلیم اور ترقی کی بات کرتے ہیں، مگر آپ کا اپنا بیٹا لندن میں بیٹھ کر 'آزادی' کے ٹویٹس کرتا ہے، جبکہ غریب کا بیٹا یہاں آپ کے کہنے پر بندوق اٹھا کر گمنام قبروں کا رزق بن جاتا ہے۔ کیا یہ منافقت نہیں؟"

سردار: "میرا بیٹا وہاں سے دنیا کو آپ کا چہرہ دکھا رہا ہے، اور یہاں کا بیٹا اپنی زمین بچا رہا ہے۔ جنگ میں کچھ لوگ لہو دیتے ہیں اور کچھ آواز... لہو غریب کا ہو یا سردار کا، وہ اس مٹی کا قرض ہے۔"

ذیشان: "اگر ریاست آج آپ کے اکاؤنٹ میں چند ارب روپے ڈال دے اور ایک بڑی وزارت دے دے، تو کیا آپ کا یہ 'مٹی کا درد' راتوں رات ختم نہیں ہو جائے گا؟ جیسے آپ کے بہت سے پرانے ساتھیوں کا ہو گیا؟"

سردار: "خریدنے والے کے پاس دولت ہونی چاہیے، مگر بیچنے والے کے پاس سودا بھی تو ہو۔ امیر خان کی مٹی کی قیمت آپ کے کاغذ کے نوٹ نہیں چکا سکتے۔ وہ جو بک گئے، وہ سردار نہیں، 'سوداگر' تھے۔"

ذیشان: "تاریخ آپ کو ایک 'حق پرست' کے طور پر یاد رکھے گی یا ایک ایسے 'باغی' کے طور پر جس نے اپنے انا کی خاطر پورے بلوچستان کو آگ کے حوالے کر دیا؟"

سردار: تاریخ وہ لکھتا ہے جو جیتتا ہے۔ اگر آپ جیت گئے تو میں 'دہشت گرد' ہوں، اور اگر میری مٹی جیت گئی تو میں 'شہید' ہوں۔ مجھے تاریخ کے قلم سے ڈر نہیں لگتا، مٹی کے فیصلے کا انتظار ہے۔"

ذیشان: "آپ لوگ صرف اپنی انا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ آپ کی آپس کی قبائلی دشمنیوں نے جتنا بلوچ کا خون بہایا، اتنا تو شاید کسی آپریشن میں نہیں بہا۔ آپ کس منہ سے خیر خواہی کی بات کرتے ہیں؟"

سردار: "وہ دشمنیاں 'غیرت' کا شاخسانہ تھیں، 'غداری' کا نہیں۔ ہم اپنوں کے ہاتھ سے مرنا قبول کرتے ہیں، کسی غیر کے جوتے تلے جینا نہیں۔"

ذیشان: "سردار صاحب! آخر ہم سب مسلمان ہیں، بلوچ اور پنجابی بھائی بھائی ہیں۔ کیا اسلام ہمیں ایک دوسرے کا خون بہانے کی اجازت دیتا ہے؟"

سردار: "بھائی چارہ برابری میں ہوتا ہے، 'آقا اور غلام' میں نہیں۔ اسلام تو حق مارنے والے کا ہاتھ پکڑنے کا حکم دیتا ہے، کیا آپ کا نظام اس پر عمل کر رہا ہے؟"

ذیشان: "سردار صاحب! آپ مذہب کی دہائی تب دیتے ہیں جب اپنی جان پر بنتی ہے، ورنہ کیا آپ کے قبائلی قوانین اسلام سے اوپر نہیں؟"

سردار: "قبائلی قانون میری مٹی کی پہچان ہے، اور اسلام میری روح کی۔ آپ کے 'قانون' نے تو اسلام کو بھی صرف اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا ہے۔"

ذیشان: "اگر کل ریاست آپ کے سامنے 'اسلامی نظام' نافذ کر دے، تو کیا آپ اپنے موروثی سرداری نظام کو ختم کر

کے ایک عام شہری بننا قبول کریں گے؟"

سردار: "ریاست کے پاس نہ اسلام ہے نہ نظام، صرف 'انتظام' ہے۔ جس دن عدلِ فاروقیؓ آئے گا، امیر خان خود مٹی میں مل جائے گا، مگر آپ کی کرسی بھی نہیں رہے گی۔"

ذیشان: "سردار صاحب! آپ کی یہ بغاوت اور ریاست سے دوری ہمارے دشمن بھارت کو خوش کر رہی ہے۔ کیا آپ کو احساس ہے کہ آپ انجانے میں دہلی کے ایجنڈے کو کامیاب کر رہے ہیں؟"

سردار: "اگر میرا حق مانگنا دہلی کو خوش کرتا ہے، تو مجھے محروم رکھ کر اسلام آباد کسے خوش کر رہا ہے؟ دشمن تب فائدہ اٹھاتا ہے جب گھر کا مالک اپنوں کو پرایا کر دے۔"

ذیشان: "آپ کی یہ تحریک پاکستان کو کمزور کر کے بھارت کو خطے کا تھانیدار بنانا چاہتی ہے، کیا آپ یہ بوجھ اٹھا سکیں گے؟"

سردار: "ریاست 'انصاف' سے مضبوط ہوتی ہے، اسلحے سے نہیں۔ آپ انصاف کریں، پاکستان خود بخود ناقابلِ تسخیر ہو جائے گا۔"

ذیشان: "کیا آپ کھلے عام بھارت کی مداخلت کی مذمت کریں گے تاکہ آپ کی وفاداری پر شک نہ رہے؟

سردار: "وفاداری کا ثبوت 'بیٹے' سے نہیں، 'کرائے دار' سے مانگا جاتا ہے۔ میں اس مٹی کا بیٹا اور مالک ہوں، کوئی مشکک قیدی نہیں کہ ہر وقت صفائیاں دیتا پھروں۔"

ذیشان: "سردار صاحب! اگر بھارت اتنا ہی ہمدرد ہے تو کشمیر میں مسلمانوں پر ظلم کیوں کر رہا ہے؟ کیا آپ کو ان کا دوہرا معیار نظر نہیں آتا؟"

سردار: "کشمیر ہو یا بلوچستان، جہاں بھی طاقتور کمزور کا گلا گھونٹے گا، وہ ظلم ہے۔ ہم کسی کے 'معیار' کے نہیں، اپنے 'حق' کے قائل ہیں۔"

ذیشان: "سردار صاحب! کل بھوشن یادو آپ ہی کے علاقے سے پکڑا گیا، آپ جیسے سرداروں نے اسے یہاں پناہ کیوں لینے دی؟ کیا یہ آپ کی ناکامی نہیں؟"

سردار: "پناہ میں نے نہیں دی، سرحد آپ کی فوج کے پاس تھی۔ اگر وہ اندر آگیا، تو سوال چوکیدار سے ہونا چاہیے، گھر کے مکین سے نہیں۔"

ذیشان: "فوج نے تو اپنی ذمہ داری پوری کی، اسے پکڑ کر جیل میں ڈالا۔ آپ نے ایک سردار ہونے کے ناطے اسے روکنے کے لیے کیا کیا؟"

سردار: "فوج کے پاس اربوں کا بجٹ اور جدید اسلحہ ہے، میرے پاس صرف لاٹھی اور مٹی ہے۔ جو کام وردی والے نہ کر سکے، وہ امیر خان کیسے کرتا؟"

ذیشان: "کل بھوشن نے اعتراف کیا کہ وہ یہاں دھماکوں کے لیے فنڈنگ کرتا تھا۔ کیا آپ اس لہو کا حساب دیں گے جو ان کے نیٹ ورک نے یہاں کے معصوم لوگوں کا بہایا؟"

سردار: جس دن ریاست اپنے پالے ہوئے 'اثاثوں' کے ہاتھوں بہنے والے معصوم بلوچوں کے خون کا حساب دے دے گی، اس دن امیر خان سے ایک 'جاسوس' کے فنڈز کا حساب مانگ لینا۔ آپ کے پاس گننے کے لیے صرف 'دھماکے' ہیں، میرے پاس گننے کے لیے 'نسلیں' ہیں۔

ذیشان: "کیا آپ کل بھوشن کو ایک دہشت گرد مانتے ہیں جس نے مظوم پاکستانیوں کا خون بہایا؟"

سردار: "میرے نزدیک ہر وہ شخص مجرم ہے جو اس مٹی پر خون بہائے، چاہے وہ سرحد پار سے آئے یا وردی پہن کر گھر کے اندر سے نکلے۔"

ذیشان: "سردار صاحب! آپ کی یہ خاموشی ثابت کرتی ہے کہ آپ کے دل میں پاکستان کے لیے نہیں بلکہ بھارت کے لیے جگہ ہے۔ کیا میں صحیح ہوں؟"

سردار: "پاکستان میرے 'وجود' میں ہے کیونکہ یہ میری مٹی ہے، مگر 'نظام' میرے دل سے اتر چکا ہے۔ جس دن آپ مٹی اور نظام کا فرق سمجھ گئے، آپ کو جواب مل جائے گا۔"

ذیشان: "سردار صاحب! کیا آپ اعتراف کریں گے کہ سکیورٹی فورسز نے دہشت گردوں کا نیٹ ورک توڑ کر بلوچستان کو بچایا ہے؟"

سردار: "نیٹ ورک ٹوٹا یا نہیں، مگر عام بلوچ کا سکون ضرور ٹوٹ گیا۔ امن وہ ہوتا ہے جس میں تلاشی نہ ہو، صرف تحفظ ہو۔"

ذیشان: "آپ فوج پر تنقید کرتے ہیں، مگر کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اگر وہ نہ ہوتے تو یہ علاقہ اب تک دشمن کے قبضے میں جا چکا ہوتا؟"

سردار: "زمین تو فوج بچا لے گی، مگر ان 'دلوں' کا کیا ہوگا جو اس جنگ میں آپ سے دور ہو گئے؟ مٹی بچانے اور انسان بچانے میں بہت فرق ہے۔"

ذیشان: "بنگلہ دیش بننے کے بعد کیا وہاں دودھ کی نہریں بہہ گئیں؟ کیا آپ بھی وہی تباہی یہاں چاہتے ہیں؟"

سردار: "بھوک کی غلامی سے آزادی کی غربت بہتر ہے؛ بنگالیوں کو روٹی سے پہلے اپنی 'شناخت' عزیز تھی۔"

ذیشان: "آپ بھی وہی زبان بول رہے ہیں جو 71 میں مجیب الرحمان بول رہا تھا، کیا انجام یاد نہیں؟"

سردار: "انجام ہمیں نہیں، ریاست کو یاد کرنا چاہیے کہ جب عوام سڑک پر آ جائیں تو دنیا کا کوئی اسلحہ اسے نہیں روک سکتا۔"

ذیشان: "بنگالیوں نے بھارت کی گود میں بیٹھ کر ملک توڑا، کیا آپ بھی وہی تاریخی غلطی دہرائیں گے؟"

سردار: "جب اپنا گھر پناہ نہ دے، تو انسان دیوار پار جھانکنے پر مجبور ہو جاتا ہے؛ یہ غلطی ہماری نہیں، گھر کے بڑے کی ہے۔"

ذیشان: "پنجاب میں بہت سے لوگ آپ کی پسماندگی پر تڑپتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سی پیک اور ترقی کا پھل آپ کو ملے۔ کیا آپ کو ہم پر بالکل اعتبار نہیں رہا؟"

سردار: "اعتبار اس دن ٹوٹ گیا تھا جب ہماری گیس سے پنجاب کے چولہے جلے اور ہماری مائیں لکڑیاں کاٹ کر تھک گئیں۔

ذیشان: "سردار صاحب! پنجاب تو آپ کی گیس کی پوری قیمت ٹیکسوں کی صورت میں چکا رہا ہے، مگر وہ پیسہ اسلام آباد سے ہوتا ہوا آپ کے بینک بیلنس تک تو پہنچ جاتا ہے، عام بلوچ کے چولہے تک کیوں نہیں پہنچتا؟ کیا یہ 'بکاؤ سردار' ہی وہ رکاوٹ نہیں جو مٹی کا سودا کر کے اپنے ہی لوگوں کو اندھیرے میں رکھتے ہیں؟"

سردار: "جس 'بکاؤ سردار' کو تم مٹی کا سودا گر کہہ رہے ہو، وہ ہم نے نہیں بلکہ تمہارے نظام نے پالا ہے تاکہ وہ ہمیں آپس میں لڑا کر تمہاری ناانصافیوں پر پردہ ڈال سکے؛ جس دن ریاست ان مہروں کو ہٹا کر براہِ راست بلوچ سے بات کرے گی، اس دن نہ گیس کا رونا رہے گا اور نہ ٹیکس کا گلہ۔"

ذیشان: " اسلام آباد یا پنجاب کو کوسنے کے بجائے آپ ان سرداروں کا گریبان کیوں نہیں پکڑتے جنہیں آپ خود ووٹ دے کر ایوانوں میں بھیجتے ہیں؟ قصوروار وہ ہے جو حق دباتا ہے، یا وہ جو آپ کا حق بیچ کر اپنی جیبیں بھرتا ہے؟"

سردار: ! جس دن اس مٹی کا عام بلوچ ان سوداگروں کا گریبان پکڑنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا، اس دن تمہاری ریاست ان 'بکاؤ سرداروں' کو بچانے کے لیے اپنی پوری طاقت لگا دے گی؛ ہم تو انہیں گھسیٹنے کو تیار ہیں، مگر کیا تمہارا نظام ان بیساکھیوں کو چھوڑنے کو تیار ہے؟"

ذیشان: ہمیں ایک موقع تو دیں۔ کیا ہم مل کر ایک ایسا پاکستان نہیں بنا سکتے جہاں نہ کوئی سردار ہو، نہ کوئی مظلوم، بس ہم سب پاکستانی ہوں؟"

سردار: یہ خواب دیکھنے میں بہت خوبصورت ہے، مگر اس خواب کی قیمت ہم نے ہمیشہ اپنے 'لہو' سے چکائی ہے۔ آپ کے پاس موقع ہے، مگر کیا آپ کے نظام کے پاس 'انصاف' ہے؟"

ذیشان: ! میں خالی ہاتھ پنجاب واپس نہیں جانا چاہتا۔ کیا آپ مجھے ایک ایسی امید دیں گے کہ میں اپنے لوگوں سے جا کر کہوں کہ بلوچ ہمیں اب بھی پیار کرتا ہے؟"

سردار: "پنجاب جا کر صرف اتنا کہنا کہ بلوچ کی 'نفرت' ریاست کے نظام سے ہے، پنجاب کے 'انسان' سے نہیں؛ جس دن تم نے ہمارے زخموں کو محض 'اعداد و شمار' سمجھنا چھوڑ کر اپنا 'ذاتی درد' سمجھ لیا، اس دن تمہیں کسی امید کی

تلاش میں یہاں نہیں آنا پڑے گا، ہم خود تمہیں گلے لگانے لاہور آئیں گے۔"

ذیشان: "سردار صاحب! اب تک میں آپ سے ایک صحافی بن کر تیکھے سوال کر رہا تھا، لیکن اب میں ایک صحافی نہیں، پنجاب کا وہ بیٹا بن کر بات کر رہا ہوں جس کا دل بلوچستان کے لیے تڑپتا ہے۔ میں سچ مچ بلوچستان کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہتا ہوں، میں اس ملک کو ٹوٹتا نہیں دیکھ سکتا۔
سردار مہر اللہ نے ٹھیک کہا تھا کہ درد دیکھنا ہے تو آپ کے پاس آؤں، مگر میرا درد دیکھ کر کیا آپ کو اب بھی لگتا ہے کہ ہم میں کوئی فرق ہے؟"
سردار امیر خان نے چند لمحوں کے لیے اپنی آنکھیں بند کیں، جیسے وہ ان برسوں کی تلخی کو پی رہے ہوں جو ان کے اور پنجاب کے درمیان حائل رہی تھی۔ پھر انہوں نے نہایت دھیمی مگر لرزتی ہوئی آواز میں کہا تمہاری اس تڑپ نے آج میرے برسوں کے جلال کو موم کر دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کئی سالوں سے کسی پنجابی حاکم یا افسر سے ہاتھ تک نہیں ملایا تھا، کیونکہ ان کے چہروں پر مجھے ہمیشہ اپنے وسائل کی لوٹ مار اور اپنے بچوں کا لہو نظر آتا تھا۔ مگر آج تمہاری آنکھوں میں مجھے وہ 'درد' نظر آیا ہے جو سرحدوں کا محتاج نہیں ہوتا۔

تمہارے سوال تیکھے ضرور ہیں، مگر ان میں 'تکبر' نہیں، بلکہ ایک 'تلاش' ہے۔
مہر اللہ نے تمھیں یہاں بھیجنے سے پہلے ٹھیک کہا تھا کہ تمہارے سینے میں ایک تڑپتا ہوا دل ہے۔ اور مجھے یہ ماننے میں کوئی عار نہیں کہ اگر پنجاب کا ہر بیٹا تمہاری طرح بلوچستان کے زخموں کو اپنا زخم سمجھنے لگے، تو دشمن تو کیا، موت بھی ہمیں جدا نہیں کر پائے گی۔ دشمنی نظام سے ہے، تم جیسے سچے انسان سے نہیں۔آج امیر خان تمہاری بلوچستان سے محبت کے سامنے اپنی ساری دوریاں بھول گیا ہے۔ذیشان: "سردار صاحب! مہر اللہ نے خضدار کے سردار زارک خان کا بھی ذکر کیا تھا۔ میرا اگلا ارادہ ان سے ملنے کا ہے۔ آپ ان کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

سردار: زارک خان خضدار کا سردار ہے اور میں یہاں کا۔ ہم سرداروں کے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔ ہماری ان کے ساتھ قبائلی دشمنی دہائیوں پرانی ہے اور وہ دشمنی اب بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ لیکن یہ دشمنی 'غیرت' کی نہیں بلکہ 'اصولوں' کی ہے۔ میں اس کے کردار پر کوئی ایسی بات نہیں کہوں گا جو میرے وقار کے خلاف ہو، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کا اور میرا راستہ بالکل الگ ہے۔"امیر خان اپنی مٹی کے حق کی بات کرتا ہے، جبکہ زارک خان کے پاس 'طاقت اور سیاست' کا اپنا ایک نظام ہے۔ ہماری دشمنی کی وجہ سے میں تمہیں وہاں کوئی 'سفارش' تو نہیں دے

سکتا، لیکن شاہ میر جانتا ہے کہ خضدار کے پہاڑوں میں سچ اور جھوٹ کے درمیان کتنی باریک لکیر ہے۔ تم اپنے طور پر جاؤ، اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔"

میں نےایک گہری سانس لی اور اپنی نوٹ بک بند کرتے ہوئے قلم جیب میں اڑس لیا۔ "سردار صاحب! آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے مجھے اپنا قیمتی وقت دیا اور اتنے مشکل سوالات کے اتنے کھلے دل سے جواب دیے۔ اب میں اور شاہ میر اجازت چاہیں گے تاکہ اپنے اگلے پڑاؤ کی طرف بڑھ سکیں۔"

سردار امیر خان کے چہرے پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ آئی اور پھر اسی مسکراہٹ کے ساتھ کہا امیر خان کے ڈیرے پر ابھی 'اجازت' کا لفظ استعمال کرنا قبل از وقت ہے۔ بلوچی روایت یہ ہے کہ مہمان جب چوکھٹ پار کر لے تو وہ صرف ہمارا مہمان نہیں، ہماری عزت بن جاتا ہے۔ کھانا تیار ہے، پہلے ہم ساتھ بیٹھ کر نمک بانٹیں گے، پھر آپ کو ہماری طرف سے خوشی خوشی اجازت ہوگی کہ آپ جہاں چاہیں جائیں۔"میں نے شاہ میر کی طرف دیکھا، جس کی آنکھوں میں ایک اطمینان تھا۔ ہم دونوں سردار کے پیچھے پیچھے حویلی کے کشادہ صحن کی طرف چل دیے جہاں دسترخوان بچھایا جا رہا تھا تھا سجی، تازہ روٹیوں اور قہوے کی خوشبو پورے ڈیرے میں پھیل گئی۔ سردار نے روایتی شفقت سے کہا، اب تم میرے دسترخوان کے شریک ہو، یہاں اب کوئی صحافی یا سردار نہیں، ہم سب ایک مٹی کے جڑے لوگ ہیں۔" کھانے کے دوران سردار نے سیاست کے بجائے اپنی جوانی کے قصے اور بلوچستان کے پہاڑوں کی کہانیاں سنائیں، جن میں ایک عجیب قسم کا سوز تھا۔

کھانا کھانے کے بعد جب ہم ہاتھ دھو کر فارغ ہوئے، تو ماحول میں ایک عجیب سا سکون اور اپنائیت تھی۔ میں نے نہایت احترام سے سردار امیر خان کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر رخصت کی اجازت چاہی۔

سردار صاحب نے مسکراتے ہوئے اپنے پاس کھڑے ایک خادم کو اشارہ کیا۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں ایک مخملی کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک نہایت خوبصورت اور بھاری بلوچی شال لے کر آیا۔ سردار صاحب نے وہ شال میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہماری طرف سے ایک تحفہ ہے۔ میں اس غیر متوقع محبت پر دنگ رہ گیا تھا۔ میں نے شال کو چھو کر دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا، "سردار صاحب! آپ کی اس بے پناہ محبت کا شکریہ۔ کیا میں دوبارہ بھی کبھی یہاں آ سکتا ہوں؟ کیا امیر خان کے ڈیرے کی یہ رونقیں مجھے پھر نصیب ہوں گی؟"

سردار نے بڑے گرم جوشی کے ساتھ کہا امیر خان جس کے لیے اپنی 'مسند' (بیٹھک) چھوڑ دے، اس کے لیے اپنے 'دروازے' کبھی بند نہیں کرتا تم جب چاہو اپنی مٹی سمجھ کر آ سکتے ہو۔

میں نے ایک بار پھر سردار امیر خان کا شکریہ ادا کیا اور مہر اللہ کے اس وفادار ڈرائیور کی طرف بڑھا جو گاڑی کے پاس ہمارا منتظر تھا۔ جیسے ہی ہم گاڑی میں بیٹھے، انجن کی گھونج نے حویلی کی پرسکون فضا میں ایک ارتعاش پیدا کیا۔ ڈرائیور نے بڑی مہارت سے گاڑی ریورس کی اور ہم دھیرے دھیرے حویلی کے اس عظیم الشان لکڑی کے پھاٹک سے باہر نکلنے لگے جس کی دیواریں صدیوں کی تاریخ اپنے اندر سموئے ہوئے تھیں۔خاران کی ہوا اب میری کھڑکی سے ٹکرا کر مجھے اجنبی نہیں لگ رہی تھی، بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ریگزار مجھے اپنی آغوش میں لے رہا ہے۔ میں اپنے ساتھ صرف ایک انٹرویو نہیں، بلکہ بلوچستان کے ایک بہت بڑے سردار کی دعا اور اس کی مٹی کا وہ وقار لے کر جا رہا تھا جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔ حویلی کے دروازے سے نکلتے وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ یہ محض ایک صحافتی ملاقات نہیں تھی، بلکہ میری زندگی کا وہ اہم موڑ تھا جس نے مجھے بلوچستان کے اس چہرے سے روشناس کرایا تھا جو اسلام آباد کی فائلوں میں کبھی نظر نہیں آتا۔

پانچواں باب۔۔۔۔۔۔پردوں کے پیچھے چھپا سردار

میں نے ڈرائیور سے سیدھا کہا کہ خضدار کی طرف چلیں اور اس نے بغیر سوال کیے جیپ کا رخ بدل دیا، جیپ اب تیزی سے اس سڑک کو چیر رہی تھی جو ہمیں بلوچستان کے ایک اور ایسے چہرے کی طرف لے جا رہی تھی جس کے بارے میں ہر شخص بات تو کرتا تھا مگر نام لیتے ہوئے آواز دھیمی کر لیتا تھا۔شاہ میر کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا جیسے وہ ہر پہاڑ کو پہچانتا ہو۔ اچانک اس نے میری طرف دیکھا اور چونک کر پوچھا، ''ذیشان بھائی... یہ خضدار کا اچانک کیسے سوچ لیا آپ نے؟میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، ''کیونکہ اب لگتا ہے زارک خان کا وقت قریب آ گیا ہے۔'' میری یہ بات سن کر شاہ میر چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گیا، جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ میں واقعی یہ کہہ رہا ہوں۔ اس نے فوراً سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا، ''تو پھر تیار رہیں... کیونکہ زارک خان تک پہنچنا مطلب صرف ایک سردار تک پہنچنا نہیں، بلکہ اس پورے جال میں داخل ہونا ہے جہاں ریاست کے لوگ بھی ہیں، اسلحہ بھی، خوف بھی اور وہ چہرے بھی جو دن میں قانون کی بات کرتے ہیں اور رات میں

سودے"، میں نے فوراً کہا، "بس پھر یہی کرنا ہے، اب آدھی بات نہیں ہوگی، اب پورا سچ سامنے آئے گا" اب تک میں بلوچستان کا درد سن رہا تھا، اب میں اُن چہروں تک جانا چاہتا ہوں جو اس درد کے پیچھے بیٹھے ہیں۔

پھر میں نے سیدھا پوچھا، "اور تم؟ تم تو اس کے قریب رہ چکے ہو... تم نے تو اس کے خلاف آواز بھی اٹھائی تھی نا؟" میری یہ بات سن کر شاہ میر کے چہرے کا رنگ بدل گیا، اس نے فوراً نظریں دوسری طرف کر لیں اور ہلکی سی تلخ ہنسی کے ساتھ بولا، "ہاں... اور اسی کی قیمت آج تک دے رہا ہوں، میرا جلا ہوا گھر صرف دیواریں نہیں تھیں ذیشان بھائی... وہ ایک پیغام تھا کہ جو زارک خان کے سامنے بولے گا، اس کا انجام کیا ہوگا"، "لیکن اسکے کارندوں کو شاید یہ پتہ نہیں تھا کہ انہوں نے ایسے جوان سے ٹکر لے لی جسے اپنے انجام کی بالکل فکر نہیں ہے۔شاہ میر نے تلخ ہنسی کے ساتھ بات جاری رکھی، "زارک خان سمجھتا ہے کہ خوف سے ہر زبان بند ہو جاتی ہے۔ شاید ہو بھی جاتی ہو... مگر ہر انسان ایک جیسا نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ جل کر راکھ نہیں بنتے... انگارہ بن جاتے ہیں۔اس کی یہ بات سن کر میں چند لمحے خاموش رہا، پھر میں نے مضبوط لہجے میں کہا، "اور شاید اب تمہارا وہ وقت آ گیا ہے شاہ میر... جب تمہارے جلے ہوئے گھر کا حساب لیا جائے گا۔" اب کھیل کھلے میدان میں ہوگا۔"
شاہ میر نے میری بات سن کر پہلی بار کھل کر ایک سخت سی مسکراہٹ دی۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور دھیمی آواز میں بولا، "اور اب حالات پہلے جیسے بھی نہیں رہے ذیشان بھائی... اب ہمارے پیچھے صرف سچ نہیں، کچھ طاقتور سائے بھی کھڑے ہیں۔
"زارک خان کی امیر خان سے پرانی دشمنی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرتے۔ ایسے میں اگر امیر خان کو ذرا بھی محسوس ہو گیا کہ ہم زارک خان کے اس نیٹ ورک کو بے نقاب کرنے نکلے ہیں... تو یہ ہمارے لیے بہت بڑی ڈھال بن سکتی ہے۔"
"اور مہر اللہ..." شاہ میر دھیمی ہنسی کے ساتھ بولا، "وہ آدمی اگر کسی کے حق میں ایک لفظ بول دے نا، تو کئی بندوقیں خاموش ہو جاتی ہیں۔ تم نے دونوں سرداروں کے دل جیت لیے ہیں ذیشان بھائی... شاید اسی لیے اب پہلی بار مجھے لگ رہا ہے کہ زارک خان تک پہنچنا ممکن ہے۔

میں نے فوراً سر ہلاتے ہوئے کہا، "بالکل شاہ میر... مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔ اسی لیے تو میں نے امیر خان سے جاتے وقت خاص طور پر زارک خان کے حوالے سے بات نکالی تھی۔ میں یہ کنفرم کرنا چاہتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان اصل کہانی کیا ہے... اور اب کافی حد تک چیزیں واضح ہو چکی ہیں۔"
"ان دونوں کی دشمنی یقیناً ہمارے لیے ایک بڑی ڈھال ثابت ہو سکتی ہے... مگر فی الحال ہم کسی کے سائے میں کام

نہیں کریں گے۔ ہمارا اپنا طریقہ ہوگا، اپنی تحقیق ہوگی، اور اپنا راستہ ہوگا۔" شاہ میر خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ میں نے مزید کہا، "ہم ابھی کسی سردار کا جھنڈا لے کر نہیں چلیں گے۔ اگر شروع میں ہی لوگوں کو محسوس ہو گیا کہ ہم کسی ایک دھڑے کے ساتھ ہیں تو پورا کھیل خراب ہو جائے گا۔ ہمیں ایسے اندر جانا ہے جیسے ہم صرف سچ کی تلاش میں آئے ہیں... نہ کسی کے آدمی، نہ کسی کے دشمن۔" شاہ میر نے آہستہ سے سر ہلایا، جیسے وہ میری بات کے وزن کو سمجھ رہا ہو۔

میں نے مضبوط لہجے میں بات جاری رکھی، "ہاں... اگر کبھی حالات ایسے بنے کہ ہماری جان یا مشن خطرے میں پڑ جائے، تب مہر اللہ یا امیر خان کی مدد ہمارے کام آ سکتی ہے۔ مگر ابھی نہیں... ابھی ہمیں اپنے قدم خود جمانے ہوں گے۔"

یہ سن کر شاہ میر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، "ذیشان بھائی... شاید یہی فرق ہے تم میں اور باقی لوگوں میں۔ یہاں اکثر لوگ بلوچستان آتے ہی کسی نہ کسی طاقت کے سائے میں پناہ ڈھونڈنے لگتے ہیں... مگر تم سیدھا آگ کے اندر جا رہے ہو۔"

میں نے فوراً جواب دیا، "کیونکہ بعض دفعہ سچ تک پہنچنے کے لیے آگ سے گزرنا پڑتا ہے شاہ میر... اور اب مجھے لگ رہا ہے کہ خضدار ہمیں وہ سب دکھانے والا ہے جسے برسوں سے چھپایا جا رہا ہے۔"

اس کے بعد کچھ دیر تک گاڑی میں خاموشی رہی، صرف انجن کی آواز اور سڑک پر ٹائروں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ سنائی دیتی رہی۔ کبھی کبھی شاہ میر کھڑکی سے باہر دیکھ کر کوئی چھوٹا سا جملہ کہہ دیتا، اور میں اس کا جواب دیتا رہتا۔ یوں ہماری گفتگو بھی سفر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، جیسے الفاظ بھی ہمارے ساتھ اس راستے پر سفر کر رہے ہوں۔ کبھی سنسان پہاڑ، کبھی لمبی سیدھی سڑکیں اور کبھی دور دور تک پھیلا ہوا ریگزار...

خضدار سے پہلے ہم نے کچھ چھوٹے چھوٹے علاقوں اور سنسان راستوں کو کراس کیا، جہاں زندگی بہت کم اور خاموشی بہت زیادہ تھی۔ کچھ جگہوں پر چیک پوسٹس بھی آئیں، جہاں گاڑی کی مختصر سی جانچ کے بعد ہمیں آگے جانے دیا گیا۔ راستے میں جب بھی کوئی موڑ آتا یا کوئی سنسان جگہ آتی، گفتگو کا رنگ بدل جاتا، مگر مقصد وہی رہتا—خضدار تک پہنچنا اور وہاں سے اگلا قدم اٹھانا۔

رات تقریباً آٹھ بجے کے قریب جب ہماری گاڑی خضدار کی حدود میں داخل ہوئی تو سڑک کے دونوں طرف پھیلا ہوا اندھیرا اور دور دور جلتی چند مدھم بتیاں ہمیں بتا رہی تھیں کہ ہم ایک نئے ماحول میں آ چکے ہیں۔ شاہ میر نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے آہستہ سے کہا، "ذیشان بھائی... ہم پہنچ گئے ہیں۔"

میں نے ڈرائیور سے سیدھا کہا، "کسی اچھے ہوٹل کی طرف لے چلو۔ پہلے ہمیں ٹھہرنا ہے، پھر آگے کا پلان دیکھیں

گے۔''

ڈرائیور نے بغیر کوئی سوال کیے گاڑی ایک سیدھی سڑک پر ڈال دی جو شہر کے اندرونی حصے کی طرف جا رہی تھی۔ چند ہی منٹوں بعد ہم ایک سادہ مگر صاف ستھرے ہوٹل کے سامنے کھڑے تھے۔ تھکن ہمارے چہروں سے واضح تھی۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وہاں کا ماحول کافی پر سکون تھا۔

ہوٹل کے ساتھ بنے چھوٹے سے روایتی بیٹھک نما ریسٹورنٹ میں ہم تینوں ایک کونے کی میز پر بیٹھ گئے اور سادہ سا کھانا آرڈر کیا۔ کھانے کے دوران زیادہ باتیں نہیں ہوئیں، بس کبھی کبھار شاہ میر کسی چیز کی طرف اشارہ کر دیتا یا میں مختصر سا جواب دے دیتا۔ پورا دن سفر میں گزرنے کے بعد بھوک بھی تھی اور جسم میں ایک عجیب سی تھکن بھی۔ کھانا ختم ہوا تو شاہ میر نے مینیجر سے کمرے کے بارے میں بات کی۔ چابی لے کر شاہ میر نے جیسے ہی ڈرائیور کی طرف دیکھا تو اس نے فوراً اپنا انداز بدل لیا۔ وہ تھوڑا سا آگے جھکا اور ادب سے بولا،

''شاہ میر صاحب... میرا کام یہاں تک تھا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اب واپس نکلنا چاہوں گا۔''میں نے کہا، ''ابھی رات ہے، آرام کر لو، صبح چلے جانا۔'' مگر وہ ہلکے سے مسکرایا اور سر ہلاتے ہوئے بولا،''نہیں ذیشان بھائی میرا کام مکمل ہو گیا ہے۔ مجھے ابھی نکلنا ہوگا۔''

شاہ میر نے اس کی طرف دیکھا، پھر خاموش رہا۔ میں نے بھی کچھ لمحے اسے دیکھ کر کہا،''ٹھیک ہے... جیسے تمہاری مرضی احتیاط سے جانا۔وہ احترام سے سر ہلا کر ہمارے ساتھ باہر تک آیا۔ ہوٹل کے باہر رات کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہم نے وہیں کھڑے ہو کر اس سے مختصر الوداعی مصافحہ کیا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی، ایک آخری نظر ہم دونوں پر ڈالی اور پھر آہستہ آہستہ سڑک کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔اس کے بعد ہم دوبارہ ہوٹل کے اندر آئے اور سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

پورا دن مسلسل سفر، بات چیت اور ذہنی دباؤ میں گزرنے کے بعد ہم دونوں بری طرح تھک چکے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی شاہ میر نے دروازہ بند کیا اور گہرا سانس لیتے ہوئے بولا،''ذیشان بھائی... آج کے لیے بس اب آرام کر لیتے ہیں۔ اصل کام کل سے شروع ہوگا۔''میں نے بھی کلائی سے گھڑی اتارتے ہوئے کہا،''ہاں... مگر کل کا دن بہت سوچ سمجھ کر چلنا ہوگا۔ ایک غلط قدم ہمیں سیدھا زارک خان کے لوگوں کے سامنے لے جا سکتا ہے۔''شاہ میر بستر کے کنارے بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا،''کل صبح سب سے پہلے رشیدا مارکیٹ جائیں گے۔ وہاں سے آپ کے لیے مکمل بلوچی لباس لیں گے۔ یہاں اگر آپ پنجابی حلیے میں گھومتے رہے تو لوگ فوراً پہچان جائیں گے کہ آپ باہر سے آئے ہیں۔''

میں نے اس کی بات غور سے سنتے ہوئے پوچھا،''اور زبان؟''
وہ ہلکا سا مسکرایا،''وہ میری ذمہ داری ہے۔ میں ساتھ ہوں، بلوچی میں بات بھی کروں گا اور لوگوں سے آپ کا تعارف بھی اپنے آدمی کی طرح کرواؤں گا۔ آہستہ آہستہ آپ خود بھی ماحول میں ڈھل جائیں گے۔''میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا،''ٹھیک ہے... پھر ہم صحافی بن کر نہیں جائیں گے۔ نہ کیمرہ سامنے ہوگا، نہ سیدھے سوال۔ پہلے ہم ان لوگوں میں گھلیں گے، ان کی بیٹھکوں میں بیٹھیں گے، عام باتوں سے آغاز کریں گے... پھر آہستہ آہستہ اصل چہروں تک پہنچیں گے۔''شاہ میر نے فوراً کہا،''بالکل... یہاں سچ سوالوں سے نہیں ملتا ذیشان بھائی، اعتماد سے ملتا ہے۔''ہم دونوں نے مختصر سا پلان بنایا، اگلے دن کے راستے اور احتیاطوں پر بات کی، اور پھر کچھ دیر بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر خضدار کی رات گہری ہوتی جا رہی تھی، جبکہ ہم دونوں آنے والے کل کے بارے میں سوچتے سوچتے آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

صبح فجر کے وقت میری آنکھ کھلی تو کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلنا شروع ہو چکی تھی۔ کھڑکی کے باہر خضدار کی ٹھنڈی صبح ایک عجیب سی خاموشی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھی۔ میں چند لمحے بستر پر لیٹا چھت کو دیکھتا رہا، جیسے اپنے ذہن کو آنے والے دن کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ شاہ میر بھی جاگ چکا تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑا باہر سڑک کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا،
''کیا ہوا؟''وہ آہستہ سے میری طرف مڑا اور بولا''یہ شہر رات سے زیادہ صبح میں خطرناک لگتا ہے... کیونکہ یہاں اصل حرکت دن نکلنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔''میں ہلکا سا مسکرایا،

''تو پھر ہمیں بھی آج حرکت میں آنا ہوگا۔''کچھ دیر بعد ہم دونوں تیار ہو کر نیچے آئے۔ ہوٹل کے چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ہم نے سادہ سا ناشتہ کیا۔ شاہ میر پورے وقت خاموش اور سوچ میں ڈوبا ہوا لگ رہا تھا، جیسے وہ ذہنی طور پر ہر ممکن صورتحال کا اندازہ لگا رہا ہو۔ ناشتہ ختم ہوتے ہی اس نے مختصر انداز میں کہا،''چلیں... پہلے رشیدا مارکیٹ۔''ہم چہروں پر ماسک پہنے ہوٹل سے باہر نکلے تو خضدار کی صبح اب پوری طرح جاگ چکی تھی۔ سڑکوں پر گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی آوازیں بڑھ رہی تھیں، جبکہ بازاروں میں دکانیں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ ہم پیدل چلتے ہوئے مرکزی بازار کی طرف بڑھنے لگے۔ راستے میں شاہ میر مجھے وہاں کے رسم و رواج کی چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھا رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم رشید امارکیٹ کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ بازار میں ہر طرف بلوچی لباس، پگڑیاں، چپلیں اور روایتی سامان کی دکانیں تھیں۔ فضا میں چائے، کپڑوں اور مٹی کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔شاہ میر سیدھا ایک پرانی دکان کی طرف بڑھا، جہاں سفید داڑھی والا ایک بزرگ خاموشی سے بیٹھا تھا۔ شاہ میر نے بلوچی زبان میں اس سے کچھ کہا، جس پر بوڑھے شخص نے پہلے مجھے غور سے دیکھا... پھر ہلکا سا سر ہلا دیا اور دکان کے اندر لے گیا۔ اندر دیواروں پر مختلف رنگوں کے بلوچی سوٹ، واسکٹیں اور پگڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ دکان کے اندر ہلکی سی عطر اور نئے کپڑوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے ایک ایک لباس کو دیکھتا رہا جبکہ وہ بزرگ کبھی کپڑوں کی طرف دیکھتے، کبھی میری طرف۔میں نے چند کپڑے دیکھنے کے بعد ایک گہرے خاکی رنگ کا بلوچی سوٹ پسند کیا۔ اس کے ساتھ ایک سادہ سی واسکٹ بھی تھی جو باقی کپڑوں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں نہیں لگ رہی تھی، اور شاید یہی چیز مجھے اچھی لگی۔ بزرگ نے خاموشی سے لباس میرے ہاتھ میں دیا اور دکان کے اندر لگے پردے کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں کپڑے لے کر اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد جب میں واپس باہر نکلا تو شاہ میر نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا، پھر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

''بس... اب ٹھیک لگ رہے ہو۔'' وہ آہستہ سے بولا، ''اب کم از کم پہلی نظر میں کوئی فوراً یہ نہیں سمجھے گا کہ تم باہر کے ہو۔''میں نے اپنی آستینیں درست کرتے ہوئے ارد گرد بازار پر نظر ڈالی۔ رشیدہ مارکیٹ اب پہلے سے زیادہ مصروف ہو چکی تھی۔ ہر طرف بلوچی زبان کی آوازیں، چائے کے برتنوں کی کھنک اور لوگوں کی آمدورفت تھی۔ میں نے شاہ میر کی طرف دیکھ کر دھیمی آواز میں کہا، ''چلو... اب مختلف ڈھابوں اور چائے خانوں میں چلتے ہیں۔ ویسے ہی عام لوگوں کی طرح بیٹھیں گے۔ زارک خان کا نام براہِ راست نہیں لیں گے... بس لوگوں کی باتوں سے اندازہ لگائیں گے کہ یہاں اصل کھیل کیا چل رہا ہے۔''شاہ میر نے خاموشی سے سر ہلایا اور پھر ہم اُس دکان سے باہر نکل آئےاور آہستہ آہستہ بازار کے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگے۔راستے بھر مختلف دکانوں، ہوٹلوں اور چھوٹے چھوٹے چائے خانوں کے باہر لوگ بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں مزدور صبح کی چائے پی رہے تھے، کہیں ٹرک ڈرائیور اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے، جبکہ کچھ بزرگ خاموشی سے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ شاہ میر جان بوجھ کر مجھے ہر اُس جگہ کے قریب لے جا رہا تھا جہاں عام لوگ بیٹھتے تھے، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اصل باتیں بند کمروں میں نہیں، انہی بازاروں اور چائے خانوں میں سننے کو ملتی ہیں۔

چلتے چلتے ہم ایک پرانے سے ڈھابے کے قریب پہنچے جہاں باہر چند ٹرک کھڑے تھے اور اندر سے چائے کے برتنوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ شاہ میر نے ایک نظر اندر ڈالی، پھر دھیمی آواز میں بولا، یہ جگہ ٹھیک ہے... یہاں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔

ہم دونوں چائے خانے کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے ایک لکڑی کی میز تھی اور آس پاس چند مزدور اپنی اپنی چائے کے ساتھ دن بھر کی تھکن اتار رہے تھے۔ شاہ میر نے دو کپ چائے منگوائی اور پھر کچھ دیر کے لیے بالکل خاموش ہو گیا ایک مزدور نے اپنا کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا،
''آج دیکھو کیا کام ملتا ہے... کل تو آدھا دن انتظار میں گزر گیا تھا۔دوسرا بولا، یہاں کام بھی کوئی پکا نہیں۔ کبھی صبح ہی لگ جاتا ہے، کبھی دوپہر تک آدمی بیٹھا رہتا ہے شاہ میر نے ہماری طرف سے بات کو بالکل عام رکھتے ہوئے کہا''ہاں یار، آج کل دیہاڑی کا بھی کیا بھروسہ ہے۔ ہم بھی کبھی کام کے لیے نکلتے ہیں تو سارا دن ادھر ادھر ہی دیکھتے رہتے ہیں۔''ایک مزدور نے اسے غور سے دیکھا۔''آپ بھی ادھر کام کرتے ہو؟''شاہ میر نے بے تکلفی سے جواب دیا، ''بس بھائی، آدمی جہاں کام ملے وہیں لگ جاتا ہے۔ آج یہاں، کل کہیں اور۔مزدور نے سر ہلایا'' صحیح کہتے ہو۔ غریب آدمی کا یہی حال ہے۔''
کچھ دیر تک بات دوبارہ روزگار، مہنگائی اور کام کی کمی کے گرد گھومتی رہی۔ شاہ میر بھی کبھی ایک جملہ کہتا، کبھی کسی کی بات پر ہنس دیتا۔ ماحول بالکل عام تھا۔ کسی کو محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ ہم کسی خاص مقصد سے ان کی گفتگو سن رہے ہیں۔ پھر شاہ میر نے چائے کا کپ ہاتھ میں لیتے ہوئے جیسے بے دھیانی میں کہا''لیکن ایک بات سمجھ نہیں آتی یار... اتنی زمینیں اور اتنا کام یہاں ہوتا ہے، پھر بھی ہم جیسے لوگوں کو کام کے لیے صبح صبح بیٹھنا پڑتا ہے۔ اوپر جو وڈیرے لوگ بیٹھے ہیں، ان کا نظام آخر چلتا کیسے ہے؟''

یہ سنتے ہی قریب بیٹھے ایک مزدور نے فوراً شاہ میر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرت آئی، جیسے اسے توقع نہیں تھی کہ ایک اجنبی اتنی جلدی اس طرف بات لے آئے گا۔بھائی ''کون بڑے لوگ؟ شاہ میر نے فوراً کندھے اچکائے۔''ارے یار، وہی... وڈیرے، سردار، بڑے زمیندار۔ ہم جیسے لوگوں کی تو ساری عمر مزدوری میں گزر جاتی ہے۔ ان کے پاس اتنی زمینیں اور اتنا اختیار کہاں سے آتا ہے؟''ایک مزدور نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا۔''آپ کو وڈیروں کے نظام سے کیا لینا دینا بھائی؟'' شاہ میر نے فوراً ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بات سنبھالی۔ ہمیں کیا لینا دینا بھائی... بس کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ایک طرف ہم ہیں، جنہیں ایک دن کی مزدوری کے لیے بھی اتنی تگ و دو کرنا پڑتی ہے، اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کے پاس اتنی زمینیں ہیں کہ نسلیں گزر جائیں پھر بھی ختم نہ ہوں۔''
پہلے مزدور نے اپنی چائے کا کپ دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے آہستہ سے کہا، ''تمہاری بات غلط نہیں ہے بھائی... یہاں یہی حال ہے

شاہ میر نے جیسے بے دھیانی میں کہا، ہاں یار لیکن سب سردار تو ایک جیسے نہیں ہوتے ؟
مزدور نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا نہیں، سب ایک جیسے نہیں ہوتے... مگر کچھ لوگوں کا اثر بہت دور تک ہے۔دوسرے مزدور نے فوراً بات پکڑ لی تم خضدار میں نئے لگتے ہو، اسی لیے پوچھ رہے ہو نا؟
شاہ میر ہنس پڑا۔ ''نیا تو نہیں، بس کافی عرصے بعد آیا ہوں۔ یہاں کے حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔مزدور نے فوراً پوچھا، ''کیا مطلب؟''

شاہ میر نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا، ''کچھ نہیں یار، بس پہلے آدمی جہاں چاہتا تھا کام کر لیتا تھا، اب لگتا ہے ہر چیز میں کسی نہ کسی بڑے آدمی کی مرضی شامل ہو گئی ہے۔''
مزدور نے سر ہلایا۔ ''ہاں، یہ بات تو ہے۔میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا میرے ذہن میں کئی سوال اٹھ رہے تھے، مگر میں نے خود کو روک لیا ابھی سوال کرنے سے زیادہ ضروری یہ تھا کہ لوگ اپنی زبان سے کیا بتاتے ہیں۔
اسی دوران میرے فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر نظر ڈالی تو ایک انجان نمبر تھا۔ میں نے چند لمحے فون کو دیکھا۔ یہاں بیٹھ کر کال سننا مناسب نہیں تھا، ایک تو مجھے بلوچی زبان پوری طرح نہیں آتی تھی اور دوسرا اس وقت ہم پہلے ہی لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔
میں خاموشی سے اٹھا اور چائے خانے سے کچھ فاصلے پر باہر آ گیا۔ فون کان سے لگاتے ہی میں نے کہا، ''ہیلو...
کون؟''دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی، پھر ایک سنجیدہ مردانہ آواز سنائی دی، ''کون ہوں، یہ ابھی چھوڑ دو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم اس وقت کہاں بیٹھے ہو؟''
میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک گیا۔ میں نے محتاط لہجے میں پوچھا، ''آپ کو اس سے کیا مطلب؟''وہ بولا، ''جس چائے خانے میں تم بیٹھے ہو، وہاں دوبارہ مت جانا۔ وہ جگہ اتنی معمولی نہیں جتنی تم سمجھ رہے ہو۔''

میرے اندر ایک عجیب سا احساس پیدا ہوا۔ میں نے فوراً پوچھا، ''آپ آخر ہیں کون؟ اور آپ کو میرے بارے میں کیسے معلوم؟''آواز قدرے دھیمی ہوئی، ''بس اتنا سمجھ لو کہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم خضدار کیوں آئے ہو اور کس کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہے ہو۔''میں نے کچھ لمحے خاموش رہ کر کہا، ''اور میں یہ کیوں سمجھوں کہ آپ میرے ہمدرد ہیں؟''دوسری طرف سے ہلکی سی سانس کی آواز آئی۔''کیونکہ اگر میں تمہارا دشمن ہوتا تو تمہیں یہ فون کبھی نہ کرتا۔''میں خاموش ہو گیا۔وہ دوبارہ بولا، ''تم جس راستے پر چل پڑے ہو، وہاں ہر آدمی وہ نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے۔ اگر واقعی سچ جاننا چاہتے ہو تو مجھ سے مل لو۔ پھر تم خود فیصلہ کر لینا کہ میں کون ہوں۔''میں نے پوچھا، ''کہاں اور کب؟''اس نے ایک جگہ اور وقت بتایا، پھر چند لمحے خاموش رہ کر کہا، ''اکیلے آنا

ضروری نہیں۔ اپنے ساتھی کو ساتھ رکھ سکتے ہو۔" میں نے مختصر جواب دیا، "ٹھیک ہے، ہم آئیں گے۔"

کال ختم ہوئی تو میں چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ میرے ذہن میں سوال ہی سوال تھے۔ ایک انجان شخص کو ہماری آمد، ہماری جگہ اور ہمارے مقصد تک کا کیسے معلوم تھا؟ میں نے فون جیب میں رکھا اور وہیں کھڑے شاہ میر کی طرف دیکھا۔ پھر ہاتھ کے ہلکے سے اشارے سے اسے چلنے کو کہا۔

شاہ میر شاید میرے چہرے سے اندازہ لگا چکا تھا کہ بات معمولی نہیں۔ اس نے چائے کا آخری گھونٹ لیا، پیسے ادا کیے اور فوراً میرے پیچھے باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی اس نے دھیمی آواز میں پوچھا، "خیر تو ہے ذیشان بھائی؟ کیا ہوا؟" میں نے چند قدم آگے بڑھ کر اسے ساری بات بتا دی۔ "ابھی ایک انجان نمبر سے کال آئی تھی۔ وہ شخص جانتا تھا کہ ہم یہاں کس مقصد سے آئے ہیں۔ اس نے کہا کہ جس سلسلے میں ہم خضدار آئے ہیں، اسے اس کا علم ہے شاہ میر کے قدم ایک لمحے کے لیے رک گئے پھر آہستہ سے بولا، "ذیشان بھائی، اگر اسے واقعی ہمارے آنے کا مقصد معلوم ہے تو یہ معمولی بات نہیں اور کیا اس نے اپنا نام نہیں بتایا؟ میں نے کہا "نہیں۔ بس اتنا کہا کہ وہ ہمارا دشمن نہیں، بلکہ ہمدرد ہے۔"

شاہ میر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا، "ملاقات کب کی ہے اور کہاں؟" میں نے جواب دیا، "بارہ بجے "کوہِ زار ہوٹل میں شاہ میر نے میری طرف غور سے دیکھا۔ "اور تم نے ہاں کر دی؟" میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، "ہم یہاں سوالوں کے جواب ڈھونڈنے آئے ہیں شاہ میر... اگر کوئی خود ہمارے سامنے جواب بن کر آ رہا ہے تو اسے دیکھے بغیر واپس تو نہیں جا سکتے۔" وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا، "ٹھیک ہے، لیکن ابھی بارہ بجنے میں وقت ہے۔ اتنی جلدی وہاں پہنچ کر بیٹھنے کا بھی فائدہ نہیں۔"

ہم نے طے کیا کہ فوراً وہاں جانے کے بجائے کچھ دیر شہر میں گھومتے ہیں بازار کی چند گلیوں سے گزرتے ہوئے ہم لوگوں کے معمولات دیکھتے رہے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا، مگر میرے ذہن میں بار بار وہی آواز گونج رہی تھی۔

"مجھے معلوم ہے تم کس سلسلے میں آئے ہو..." جب گھڑی نے ساڑھے گیارہ بجائے تو شاہ میر نے میری طرف دیکھااب چلنا چاہیے۔ میں نے سر ہلایا۔ "ہاں، اب دیر کرنا مناسب نہیں۔ہم بازار کی گلی سے نکل کر مرکزی سڑک کی طرف آئے کچھ فاصلے پر ایک رکشہ کھڑا تھا شاہ میر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا، کرایہ طے کیا اور ہم دونوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے رکشہ شہر کی سڑکوں سے گزرتا ہوا آہستہ آہستہ کوہِ زار ہوٹل کی طرف بڑھنے لگا

راستے میں خضدار کی دوپہر اپنی رفتار پکڑ چکی تھی دکانوں کے سامنے لوگوں کی آمدورفت بڑھ تھی اور سڑک پر گاڑیوں، موٹر سائیکلوں اور رکشوں کا شور پھیلتا جا رہا تھا۔کچھ ہی دیر بعد رکشہ کوہِ زار ہوٹل کے سامنے رک گیا۔ شاہ میر نے کرایہ ادا کیا اور ہم دونوں رکشے سے اتر گئے۔

میں نے ایک لمحے کے لیے ہوٹل کی عمارت کو دیکھا، پھر شاہ میر کی طرف اشارہ کیا۔"چلو... دیکھتے ہیں، آج ہمیں کون سا سچ اپنے سامنے ملنے والا ہے۔"ہم دونوں ہوٹل کے اندر داخل ہوئے اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔سیڑھیاں چڑھتے ہوئے شاہ میر نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں اس کے قدموں کے ساتھ قدم ملاتا ہوا اوپر پہنچا۔
اوپری منزل کا ماحول نیچے کی نسبت کافی خاموش تھا۔ چند میزوں پر دو چار لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے، جبکہ کھڑکیوں سے باہر شہر کی سڑکیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ہم چند لمحے وہیں کھڑے رہے۔شاہ میر نے دھیمی آواز میں پوچھا، "کون سی میز؟"میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اسی وقت میری نظر کمرے کے آخری حصے میں کھڑکی کے قریب رکھی ایک میز پر پڑی۔ وہاں ایک شخص اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے چائے کا کپ رکھا تھا اور وہ بظاہر اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا، "شاید وہی ہے۔"ہم دونوں اس کی طرف بڑھے۔
میں اس شخص کے قریب پہنچا تو ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ اس نے اخبار سے نظریں اٹھائیں، مگر کچھ نہیں کہا مجھے فون پر کہی ہوئی اس کی بات یاد آئی۔ میں نے طے شدہ جملہ دہرایا،
"خضدار کی چائے مشہور ہے؟"
اس شخص نے میری طرف چند لمحے دیکھا، پھر بالکل اسی انداز میں جواب دیا،
"چائے سے زیادہ یہاں کے قصے مشہور ہیں۔"یہ وہی جملہ تھا جو فون پر کیا گیا تھا میں سمجھ گیا کہ ہم صحیح شخص تک پہنچ چکے ہیں۔شاہ میر نے بھی ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا میں نے ہلکا سا سر ہلایا اور ہم دونوں اس کے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔اس شخص نے ویٹر کو اشارہ کیا تین لوگوں کا کھانا لے آؤ ویٹر نے سر ہلایا اور واپس چلا گیا۔
اب وہ شخص پہلی بار پوری توجہ سے ہماری طرف متوجہ ہوا۔ اس کی نگاہ پہلے شاہ میر پر ٹھہری، پھر مجھ پر۔تو آپ ذیشان ہیں...
میں نے مختصر جواب دیا، جی۔ اور یہ شاہ میر ہے۔
وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر آہستہ سے بولا" مجھے معلوم ہے۔ اسی لیے تو آپ دونوں کو یہاں بلایا ہے۔ویٹر کھانا رکھ کر واپس چلا گیا۔ وہ شخص کچھ دیر خاموشی سے ہمیں دیکھتا رہا۔ اس کے بیٹھنے کے انداز میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ تھا؛ نہ

جلدی، نہ بے چینی۔ وہ بار بار کھڑکی سے باہر دیکھنے کے بجائے پورے ہال پر نظر ڈال رہا تھا، جیسے یہاں موجود ہر شخص اور ہر راستے کو پہلے ہی جانتا ہو۔

وہ ہلکا سا مسکرایا اور بولا
''میں اپنا تعارف مکمل کر دیتا ہوں، میرا نام میجر سعید ہے۔
میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔میجر...؟
وہ پر سکون انداز میں بولا،جی
میں نے دوبارہ پوچھا،آپ کا تعلق فوج سے ہے؟
اس نے ہلکا سا سر ہلایا۔
جی، میرا تعلق فوج سے ہے۔"میں نے ایک لمحے کے لیے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے انداز اور بات کرنے کے طریقے سے مجھے پہلے ہی کچھ اندازہ ہو چکا تھا، اس لیے اب مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ البتہ ایک بات میرے ذہن میں ضرور کھٹکی کہ ہم خضدار پہنچے ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا، پھر اسے ہمارے بارے میں اتنی معلومات کیسے مل گئیں؟
میں نے سیدھا سوال کیا،
لیکن آپ ہمارے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتے ہیں؟
میجر سعید نے چند لمحے میری طرف دیکھا، پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا،
''آپ کے بارے میں جاننا اتنا مشکل نہیں تھا۔"میں نے پوچھا،''وہ کیسے؟"
وہ ذرا آگے جھکا اور دھیمی آواز میں بولا،آپ خضدار آنے سے پہلے ہی ہماری نظر میں آ چکے تھے۔
میں خاموش ہو گیا۔
اس کے الفاظ سنتے ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اگر ایک فوجی افسر ہماری آمد سے پہلے ہی ہمارے بارے میں جانتا تھا، تو غالباً اس کا تعلق کسی ایسے شعبے سے تھا جہاں لوگوں کی نقل و حرکت اور سرگرمیوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔
میں نے دل ہی دل میں سوچا، شاید یہی وجہ ہے کہ اسے ہمارے مقصد کا بھی اندازہ تھا۔
شاہ میر نے بھی میری طرف دیکھا، جیسے وہ میرے ذہن میں چلنے والی بات سمجھ گیا ہو میں نے دوبارہ میجر سعید سے پوچھا،''تو آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہم خضدار کس مقصد سے آئے ہیں؟میجر سعید نے میری طرف دیکھا اور چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا،

"""ہاں، مجھے معلوم ہے۔ آپ کی تلاش کا رخ کہاں ہے،
میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،
"اور اگر میں کہوں کہ ہم صرف عام لوگوں سے ملنے اور بلوچستان کو سمجھنے آئے ہیں؟"
وہ مسکرایااور بولا "تو میں کہوں گا کہ آپ نے اپنی اصل بات چھپالی۔"شاہ میر نے فوراً بات سنبھالتے ہوئے کہا،
میجر صاحب، ذیشان بھائی صحافی ہیں۔ ظاہر ہے جہاں جائیں گے، لوگوں سے بات چیت کریں گے سوال کرینگے۔ اس میں چھپانے والی کیا بات ہے؟"میجر سعید نے شاہ میر کی طرف دیکھا۔"صحافت میں سوال پوچھنا معمول کی بات ہے، شاہ میر۔ "لیکن ذیشان کے سوال عام صحافتی سوالوں جیسے نہیں ہیں۔میں نے پوچھا،آپ کو ہمارے سوالوں سے مسئلہ ہے؟
اسنے دھیمے لہجے میں کہا"مسئلہ نہیں۔ دلچسپی ہے۔میں نے پوچھا کیسی دلچسپی؟"
اسنے مسکراتے ہوئے کہا"بس یہ جاننے میں کہ آپ کی منزل کہاں ہے۔"
میں نے اس کی بات پر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،
"منزل کا اندازہ تو شاید آپ کو پہلے ہی ہو چکا ہے، میجر صاحب۔"وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا"اندازہ ہے... یقین نہیں۔" میں نے فوراً پوچھا،"اور یقین کیسے ہوگا؟"میجر سعید نے سکون سے جواب دیا،"جب آپ دونوں خود بتائیں گے کہ یہاں کس چیز کی تلاش میں آئے ہیں۔"
میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور کہا،
"لیکن ہم آپ پر اعتبار کیوں کریں، میجر صاحب؟
میجر سعید نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا،"اعتبار مانگا نہیں جاتا، کمایا جاتا ہے۔ میں آپ کو ایسی معلومات دوں گا کہ آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا پڑ جائے گا۔" میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور کہا،
"لیکن معلومات تو کوئی بھی دے سکتا ہے، میجر صاحب۔ ضروری نہیں کہ وہ کسی سرکاری ادارے سے ہو۔"
میجر سعید نے چند لمحے مجھے دیکھا۔ پھر اس نے جیب سے اپنا ایک کارڈ باہر نکالا اور میز پر میری طرف سرکا دیا۔"آپ کی بات درست ہے۔ اسی لیے صرف میری بات پر یقین کرنے کی ضرورت نہیں۔"میں نے کارڈ اٹھا کر دیکھا۔ اس پر اس کی تصویر، نام اور سرکاری تفصیلات درج تھیں۔میں نے کارڈ واپس کرتے ہوئے کہا،
"اچھا... تو واقعی میجر سعید ہیں آپ۔"وہ ہلکا سا مسکرایا۔"اب کم از کم میرا تعارف تو ثابت ہوگیا۔ باقی باتوں کا فیصلہ آپ خود کریں گے۔"
میں نے سر ہلایا اور کہا اپ ہم پر اعتبار کیوں کر رہے ہیں
میجر سعید نے سنجیدگی سے جواب دیا کیونکہ اپکے اندر ایک غیرت مند پاکستانی کا خون دوڑتا ہے میں آپ دونوں کے

بارے میں بغیر کچھ جانے یہاں نہیں آیا۔ میں نے آپ کے بارے میں کافی چھان بین کی ہے۔ آپ کون ہیں، اب تک کہاں کہاں گئے ہیں... ان سب چیزوں کا مجھے اندازہ ہے۔ اس لیے بے فکر رہیں، میں نے یہ ملاقات کسی اندازے پر نہیں رکھی۔''

میں نے کہا،

''ٹھیک ہے، پھر پہلے آپ اپنی بات شروع کریں۔ آپ نے ہمیں یہاں بلایا ہے، تو کچھ نہ کچھ وجہ ضرور ہو گی۔''

میجر سعید نے سامنے رکھا گلاس اٹھایا، ایک گھونٹ پیا اور آہستہ سے بولا،''اچھا ذیشان صاحب... اب سیدھی بات کرتے ہیں۔ آپ جس شخص کے بارے میں معلومات جمع کر رہے ہیں، اس کا نام سردار زارق خان ہے، ٹھیک؟''میں نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا بالکل میں اسی کیلئے یہاں ایا ہوں

میرے جواب پر میجر سعید کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور بولا

''مجھے آپ کی یہ بات پسند آئی کہ آپ نے گھما پھرا کر جواب نہیں دیا۔''

وہ کچھ لمحے رکا، پھر بولا،

سردار زارق خان کے بارے میں میرے پاس کافی معلومات موجود ہیں۔ اس کے اپنے علاقے میں اثر و رسوخ کی نوعیت کیا ہے، کن لوگوں سے اس کے رابطے ہیں، اس کے زیرِ اثر کون سے معاملات چلتے ہیں، اور اس کے بیرونِ علاقے لوگوں سے کس قسم کے روابط ہیں... ان سب کے بارے میں میرے پاس الگ الگ معلومات موجود ہیں۔''میں نے پوچھا،

''اور یہ معلومات کتنی قابلِ اعتماد ہیں؟''میجر سعید نے سنجیدگی سے جواب دیا،

''کچھ معلومات ایسی ہیں جن کی میں تصدیق کر چکا ہوں جبکہ کچھ ابھی مزید جانچ کے مرحلے میں ہیں۔

میں آپ کو صرف وہی بات بتاؤں گا جس کے پیچھے کوئی بنیاد موجود ہو۔''

میں نے کہا،''پھر مسئلہ کہاں ہے؟''میجر سعید نے گہری سانس لی اور بولا

''مسئلہ یہ ہے کہ معلومات میرے پاس ہونے کے باوجود میں ہر جگہ اپنی مرضی سے نہیں جا سکتا آپ خود صحافی ہیں آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک سرکاری افسر کی اپنی حدود ہوتی ہیں ہم وردی میں رہ کر ہر جگہ ہر شخص اور ہر معاملے میں کھل کر مداخلت نہیں کر سکتے۔

میں نے کہا،''اور آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں؟''میجر سعید نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

''آپ کے پاس وہ چیز ہے جو میرے پاس نہیں...۔''جہاں مجھے رکنا پڑتا ہے، وہاں آپ آگے جا سکتے ہیں اپ ایک صحافی ہیں آپ آزاد ہو کر سوال کر سکتے ہیں لوگوں تک جا سکتے ہیں، ثبوت دیکھ سکتے ہیں اور جو کچھ سامنے آئے اسے اپنے نام سے دنیا کے سامنے رکھ سکتے ہیں

میں نے چند لمحے خاموش رہ کر اسے دیکھا، پھر پوچھا،
''تو آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ مل کر کام کریں؟''
میجر سعید نے سر ہلایا۔''ہاں۔ لیکن ایک بات واضح ہے... میں آپ کو اپنے ماتحت نہیں سمجھتا اور نہ آپ میرے لیے کام کریں گے۔ ہم اپنی اپنی حدود میں رہ کر ایک ہی مقصد کے لیے کام کریں گے۔''
شاہ میر نے پہلی بار قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا،''مقصد کیا ہوگا؟''
میجر سعید نے جواب دیا،''سردار زارق خان کی حقیقت کو سامنے لانا۔''میں نے کہا،''لیکن آپ نے کہا تھا کہ آپ ہمیں ایسی معلومات دیں گے جس سے ہمیں آپ پر اعتبار کرنا پڑے گا۔''میجر سعید نے چند لمحے میری طرف دیکھاوہ ذرا آگے جھکا اور دھیمی آواز میں بولا،''خضدار سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ وہاں عطا حسین نام کا ایک آدمی رہتا ہے۔''شاہ میر نے پوچھا،
''عطا حسین کون ہے؟''
میجر سعید نے جواب دیا،
''عام آدمی ہے اسی علاقے کا رہنے والا لیکن کچھ عرصہ سردار زارق خان کے لوگوں کے قریب رہا ہے۔ اس نے ایسی چیزیں دیکھی ہیں جن کے بارے میں ہم کو کہیں اور سے معلومات نہیں مل سکتیں آپ دونوں اس کے پاس جائیں اس سے بات کریں اور جو کچھ وہ جانتا ہے معلوم کریں میں نے فوراً پوچھا،اگر آپ کو معلوم ہے کہ وہ زارق خان کے لوگوں کے اتنے قریب رہا ہے تو آپ نے خود اس سے پوچھ گچھ کیوں نہیں کی؟میجر سعید نے گہری سانس لی اور کہا کیونکہ مجھے بھی اس کے بارے میں زیادہ عرصہ نہیں ہوا معلوم ہوئے۔چند دن پہلے ہی ایک ذریعے سے اس کا نام میرے سامنے آیااس کے بعد سے میں اپنی طرف سے اس کے بارے میں معلومات جمع کر رہا ہوں کاش یہ اتنا آسان ہوتا آپ جانتے ہیں کہ میں وردی میں ہوں میری ایک حد ہے میں ہر جگہ اپنی مرضی سے جا کر کسی شخص سے سوال جواب شروع نہیں کر سکتا ہماری ہر چیز ریکارڈ ہوتی ہے خاص طور پر ایسے معاملے میں جہاں ابھی میرے پاس مکمل ثبوت بھی موجود نہیں

میں نے پوچھا،تو پھر آپ اکیلے یہ سب کیسے کر رہے ہیں؟میجر سعید نے جواب دیاجتنی معلومات میرے ذرائع سے مل سکتی ہیں، میں جمع کر رہا ہوں۔ مختلف باتوں کو آپس میں ملا کر دیکھ رہا ہوں لیکن ایک چیز کی کمی ہے میں نے پوچھا،کس چیز کی؟میجر سعید نے سیدھا میری طرف دیکھااور کہا گراؤنڈ پر جا کر بات کرنے والے ایک قابل اعتماد آدمی کی۔''مجھے نہ کوئی ایسا آدمی ملا جس پر اس معاملے میں مکمل اعتماد کر سکوں، نہ ایسا صحافی جسے میں یہ بات بتا سکوں۔ پھر آپ کے بارے میں معلوم ہوا میں نے حیرت سے پوچھا

میرے بارے میں؟

ہاں۔ آپ صحافی ہیں لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں، سوال کر سکتے ہیں اور سب سے اہم بات... آپ کے پاس یہ اختیار ہے کہ جو کچھ سامنے آئے اسے خود جانچ سکیں۔

میں نے کچھ دیر سوچا، پھر کہا،''تو آپ چاہتے ہیں کہ ہم عطا حسین سے ملیں، اس کی بات سنیں اور جو معلومات ملیں وہ آپ تک پہنچائیں؟ میجر نے جواب دیا بالکل میں نے پوچھااور اس کے بعد؟ میجر سعید نے کہا

''اس کے بعد ہم ایک ایک کڑی جوڑیں گے اگر عطا حسین کی بات کسی دوسری معلومات سے ملتی ہے تو اگلا قدم واضح ہو گا اور جوں جوں حقیقت سامنے آتی جائے گی، آپ کا مجھ پر اعتماد بڑھتا جائے گا اور ہم زارق خان کے گرد گھیرا تنگ کرتے جائیں گے''اور ایک بات اور سمجھ لیں۔ میں اس معاملے میں کسی باقاعدہ ٹیم کے ساتھ کام نہیں کر رہا۔ جو کچھ کر رہا ہوں، اپنی ذمہ داری کی حدود میں رہ کر اور بہت احتیاط سے کر رہا ہوں۔''میں نے حیرت سے پوچھا،''کیوں؟ کیا آپ کو اپنے ہی لوگوں پر اعتماد نہیں؟''میجر سعید نے چند لمحے خاموش رہ کر جواب دیا''اعتماد ہے... لیکن مکمل نہیں فوج میں بھی ہر شخص دوست نہیں ہوتا، اور ہر قریب کھڑا آدمی ضروری نہیں کہ آپ کے مفاد میں ہو۔ کبھی کبھی کسی معاملے کو جتنا محدود رکھا جائے، اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔''میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

''یعنی آپ یہ کام اپنی سرکاری ذمہ داری سے الگ رہ کر کر رہے ہیں؟''

میجر سعید نے ہلکا سا سر ہلایا ہاں۔ اس معاملے میں میں بالکل اکیلا ہوں اور شاید اس لیۓ ابھی تک محفوظ بھی ہوں میں نے چند لمحے سوچا، پھر کہا،

تو پھر شاید یہی بہتر ہے۔ مجھے بھی ایسے کام میں زیادہ لوگوں کی موجودگی پسند نہیں۔''جو بات آج یہاں ہوئی ہے، وہ یہیں رہے گی۔ ہم تینوں کے علاوہ کسی چوتھے شخص کو اس کا علم نہیں ہونا چاہیے۔''میجر سعید نے میری طرف دیکھا اور بولا،

''مجھے یہی جواب سننے کی توقع تھی باقی باتیں اگلی ملاقات پر پہلے عطا حسین سے مل کر دیکھیں کہ وہ تمھیں کیا بتاتا ہے میں نے کہاٹھیک ہے پھر ہم اب اسی طرف چلتے ہیں میجر سعید نے گھڑی پر نظر ڈالی ابھی وقت مناسب ہےاگر جانا ہے تو دیر نہ کریں میں نے شاہ میر کی طرف دیکھا اس نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

ہم نے کھانا ختم کیا میں نے میز پر پڑا گلاس ایک طرف رکھا اور سعید سے کہا، تو پھر اجازت دیں، میجر صاحب جو کچھ سامنے آئے گا، آپ تک پہنچائیں گے۔

میجر سعید نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اللہ حافظ اور احتیاط سے جانا۔

ہم دونوں اپنی نشست سے اٹھے میجر سعید وہیں بیٹھا رہا، جبکہ ہم سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ باہر نکلتے ہی شاہ میر

نے دھیمی آواز میں کہا، چلیں؟میں نے سر ہلایا۔
"ہاں اب عطا حسین کی باری ہے۔"ہم ہوٹل سے باہر نکلے اور خضدار کی سڑک پر آ گئے دوپہر کا وقت تھا اور بازار میں معمول کے مطابق لوگوں کی آمدورفت جاری تھی ہم نے طے کیا کہ مزید وقت ضائع کیے بغیر عطا حسین کے گاؤں کی طرف روانہ ہوں گے۔
راستے بھر شاہ میر خاموش رہا۔ میں بھی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے میجر سعید کی باتوں کو ذہن میں دہراتا رہا۔ عطا حسین کا نام میرے لیے ابھی صرف ایک نام تھا، لیکن اب یہی نام ہماری اگلی کڑی بن چکا تھا۔کچھ دیر بعد شاہ میر نے خاموشی توڑی تمھیں کیا لگتا ہے؟میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا"کس بارے میں؟ شاہ میر نے کہا
"میجر سعید کے بارے میں۔"
میں نے چند لمحے سوچا۔"ابھی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس نے کچھ ایسی باتیں ضرور بتائی ہیں جنھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا،
شاہ میر نے کہا،"اور اگر عطا حسین نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا؟میں نے باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا،
"تو ہم واپس آ جائیں گے کچھ دروازے پہلی دستک پر نہیں کھلتے۔"کچھ دیر بعد گاڑی ایک نسبتاً خاموش راستے پر مڑ گئی۔ شہر کی عمارتیں پیچھے رہ گئیں اور آبادی کم ہوتی چلی گئی۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے گھر، دکانیں اور کھیت نظر آنے لگے۔
شاہ میر نے باہر دیکھتے ہوئے کہا، لگتا ہے شہر کافی پیچھے رہ گیا ہے میں نے جواب دیا،
"ہاں شاید یہی وہ جگہ ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کو نام سے نہیں، چہرے سے پہچانتے ہیں کچھ ہی دیر بعد شاہ میر نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا"یہیں سے آگے پیدل جانا بہتر ہوگا۔"
ہم دونوں گاڑی سے اتر گئے۔ سامنے ایک تنگ سا راستہ آبادی کے اندر جا رہا تھا۔ میں نے جیب سے وہ کاغذ نکالا جس پر عطا حسین کا نام اور گھر کی نشانی درج تھی۔
شاہ میر نے پوچھا،"گھر کا پتا یاد ہے؟"میں نے کاغذ دیکھ کر کہا،"مسجد کے بعد تیسرا گھر۔ سامنے نیم کا درخت ہے۔"ہم خاموشی سے آگے بڑھنے لگے راستے میں چند بچے کھیل رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ایک لمحے کو رک گئے، پھر دوبارہ اپنے کھیل میں مصروف ہوگئے۔
کچھ فاصلے پر واقعی ایک چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ اس کے آگے تین گھر تھے اور تیسرے گھر کے سامنے ایک پرانا نیم کا درخت کھڑا تھا۔
میں رک گیا"شاید یہی ہے۔"
شاہ میر نے گھر کو غور سے دیکھا۔"کسی سے دوبارہ تصدیق کر لیں؟"میں نے سر ہلایا۔قریب بیٹھے ایک شخص سے

پوچھا،
''بھائی، عطا حسین کا گھر یہی ہے؟''اس نے ہماری طرف دیکھا اور مختصر جواب دیا،
''ہاں، یہی ہے۔''ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
اب ہمارے سامنے وہ شخص تھا جس کا ذکر میجر سعید نے اتنے اعتماد سے کیا تھا۔
میں نے دروازے کے قریب جا کر دستک دی۔اندر سے کچھ دیر خاموشی رہی۔پھر ایک محتاط سی آواز آئی،''کون ہے؟''میں نے جواب دیا،
''عطا حسین سے ملنا تھا۔
دروازہ کھلا اور سامنے عطا حسین کھڑا تھا اس نے پہلے مجھے دیکھا، پھر شاہ میر کو۔ اس کے چہرے پر اجنبیت کے ساتھ ہلکی سی تشویش بھی دکھائی دی ''کون ہیں آپ؟''میں نے نرم لہجے میں کہا،میرا نام ذیشان ہے، اور یہ شاہ میر ہیں آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔''مجھ سے؟جی اگر آپ کے پاس تھوڑا وقت ہو۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر دروازہ ذرا سا مزید کھول دیا اندر آ جائیں ہم اندر داخل ہوئے تو عطا حسین ہمیں گھر کے اندر لے جانے کے بجائے صحن کے ایک طرف بنی ہوئی بیٹھک میں لے گیا۔ کمرے میں ایک طرف چند چارپائیاں بچھی تھیں اور دیوار کے ساتھ لکڑی کی دو کرسیاں رکھی تھیں اس نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا تشریف رکھیں میں اور شاہ میر ایک چارپائی پر بیٹھ گئے، جبکہ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا شاہ میر نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،آپ کے گاؤں میں تو لگتا ہے ہر آدمی ایک دوسرے کو جانتا ہے عطا حسین بھی ہلکا سا مسکرایا۔
''یہ گاؤں ہے صاحب، یہاں کسی کے آنے جانے کی خبر دیر سے نہیں رہتی میں نے کہا ہمیں بھی آتے ہوئے اندازہ ہو گیا تھا۔عطا حسین نے ہماری طرف دیکھا اور پوچھا آپ لوگوں نے کھانا کھایا ہے یا کچھ کھانے کا انتظام کروں؟میں نے فوراً کہا،
نہیں نہیں، آپ زحمت نہ کریں۔ ہم کھانا کھا کر ہی نکلے ہیں۔عطا حسین نے اطمینان سے سر ہلایا۔
''اچھا، پھر چائے تو پیئیں گے؟میں نے مسکرا کر کہا،
''جی، اگر آپ زحمت نہ کریں تو زحمت کیسی؟ مہمان گھر آئے ہوں تو چائے تو بنتی ہے۔
وہ اٹھا اور بیٹھک سے باہر چلا گیا۔ صحن کے دوسرے حصے میں اس کی بیوی اور بچے موجود تھے۔ وہ کچھ دیر ان سے بات کرتا رہا، اور پھر چائے کا کہہ کر فوراً واپس بیٹھک میں آ گیا۔
اور بولا بس چائے آ رہی ہے۔
میں نے کہا بہت شکریہ پھر اسنے پوچھا اب بتایئے، اصل بات کیا ہے؟ اتنی دور صرف چائے پینے تو نہیں آئے ہوں

گے میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا آپ نے ٹھیک پہچانا دراصل ہمیں آپ سے کچھ ایسی باتیں پوچھنی ہیں جن کا جواب شاید آپ ہی دے سکتے ہیں۔ شاہ میر نے میری طرف دیکھا اور پھر عطا حسین سے بولا، ''اصل میں ذیشان بھائی پنجاب سے آئے ہیں۔ صحافت کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے حالات پر تحقیق بھی کر رہے ہیں۔ عطا حسین نے میری طرف دیکھا۔ ''صحافی ہیں؟''

میں نے سر ہلا کر کہا،

''جی ہاں۔ عطا حسین نے چند لمحے مجھے دیکھا، پھر پوچھا، ''تو آپ مجھ سے بھی کچھ پوچھنے آئے ہیں؟''

شاہ میر نے ہلکے سے مسکرا کر جواب دیا، جی، ہم علاقے کے مختلف لوگوں سے مل چکے ہیں اور مزید لوگوں سے ملنے کا ارادہ ہے

ہر آدمی اپنے علاقے اور حالات کو اپنے انداز سے دیکھتا ہے آپ کا نام بھی ہمیں اسی سلسلے میں ملا، تو سوچا آپ سے بھی بات کر لی جائے۔ ہم ابھی چند باتیں ہی کر پائے تھے کہ باہر سے قدموں کی آہٹ سنائی دی کچھ دیر بعد اس کا تقریباً سترہ سالہ بیٹا ہاتھ میں چائے کی ٹرے لیے بیٹھک میں داخل ہوا اس نے خاموشی سے ٹرے ہمارے سامنے کی عطا حسین نے اس کی طرف دیکھ کر کہا،

رکھ دو بیٹا لڑکے نے سر ہلایا اور واپس چلا گیا۔

عطا حسین نے چائے کا کپ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا،

''لیجیے، پہلے چائے پی لیں، پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔

میں نے کپ اٹھایا اور کہا،

جی، بالکل کچھ لمحے ہم خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ باہر بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور صحن میں معمول کی گھریلو مصروفیت جاری تھی۔ میں نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا، عطا صاحب، آپ اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں؟ اس نے سر ہلایا۔ جی، پیدائش بھی یہیں کی ہے اور زیادہ تر زندگی بھی یہیں گزری ہے۔ میں نے پوچھا، آپ کا اپنا کام کیا ہے؟ کبھی کھیتی باڑی کی، کبھی لوگوں کے ساتھ مزدوری اور کاروبار کا کام کیا۔ یہاں آدمی ایک ہی کام سے ساری زندگی نہیں چلا سکتا۔ میں نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا

یعنی کام کے سلسلے میں آپ کو علاقے کے مختلف لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی رہا ہو گا؟ عطا حسین نے ہلکا سا سر ہلایا ہاں، کام ہی ایسا ہے۔ آدمی کو ہر طرح کے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ میں نے قدرے توقف کے بعد پوچھا،

کیا آپ نے سردار زارق خان کے لوگوں کے ساتھ بھی کبھی کام کیا ہے؟ عطا حسین نے چند لمحے میری طرف دیکھا، پھر سر ہلا کر کہا،

جی، کیا ہے۔ کچھ عرصہ ان کے ساتھ کام کرتا رہا ہوں۔

میں نے پوچھا، کس نوعیت کا کام تھا؟ عطا حسین نے چائے کا کپ نیچے رکھتے ہوئے کہا،
''میں تعمیر اور مرمت کا کام کرتا تھا۔ میں نے پوچھا،
''سردار زارق خان کے گھر پر بھی کام کیا تھا؟ وہ فوراً بولا، نہیں، ان کے ذاتی گھر پر نہیں۔ ان کی مختلف جگہوں پر جہاں تعمیر یا مرمت کا کام چلتا تھا، وہاں میں نے کام کیا ہے میں نے پوچھا، مثلاً کہاں کہاں؟ عطا حسین نے ذرا سوچ کر کہا، ایک جگہ شہر سے باہر تھی وہاں ایک چھوٹا سا احاطہ بن رہا تھا، چار پانچ کمرے تھے اور اردگرد اونچی دیوار۔
کہا گیا تھا کہ سامان رکھنے اور آدمیوں کے ٹھہرنے کے لیے جگہ بنائی جا رہی ہے۔
دوسری جگہ پہاڑی کی طرف تھی۔ وہاں پہلے سے ایک پرانی عمارت بنی ہوئی تھی۔ اس کے دو کمروں کی مرمت ہوئی، چھت دوبارہ بنائی گئی اور ایک طرف نئی دیوار کھڑی کی گئی۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا، ان جگہوں پر کام کی نگرانی کون کرتا تھا؟ عطا حسین نے جواب دیا، زیادہ تر ایک ہی آدمی آتا تھا، بشیر۔ وہ سردار کے کاموں کو دیکھتا تھا۔'' اس کے علاوہ سردار زارق خان کی کوئی اور جگہ بھی تھی جہاں آپ نے کام کیا ہو؟ عطا حسین نے سر ہلایا۔ ہاں، ایک مرغیوں کا فارم بھی بنایا تھا۔ سردار کے پرانے ڈیرے کے قریب تھا۔ چھ بڑے شیڈ تھے۔ وہ فارم بھی ہم نے ہی بنایا تھا۔ میں نے پوچھا، صرف شیڈ بنائے تھے یا وہاں اور بھی کچھ بنایا تھا؟ عطا حسین نے کہا،
شیڈ کے ساتھ نیچے ایک تہہ خانہ بھی بنایا تھا۔ میں نے حیرت سے پوچھا، تہہ خانہ؟ فارم کے نیچے؟ عطا حسین نے کہا ہاں ہمیں بتایا گیا تھا کہ سامان رکھنے کے لیے ہے۔ میں نے پوچھا،
''کس قسم کا سامان؟ عطا حسین نے ذرا توقف کیا اور بولا سردار کے آدمیوں کا کچھ مال وہاں آتا جاتا تھا۔
میں نے عام انداز میں پوچھا،
کیسا مال؟ عطا حسین نے کہا اسلحہ وغیرہ آتا تھا۔

میں نے جیسے پہلی بار یہ بات سنی ہو، ہلکے سے کہا اچھا... اسلحہ؟ یہ کہاں سے آتا تھا؟ وہ مسکرایا اور بولا آپ کو یہ بھی نہیں معلوم؟ ان کی اپنی فیکٹری ہے مستونگ کی طرف کافی بڑا کام ہے وہاں۔ میں نے فوراً کوئی خاص ردِ عمل نہیں دیا، بس سر ہلا کر کہا، اچھا... مجھے اس بارے میں تفصیل معلوم نہیں تھی۔ عطا حسین نے بات جاری رکھی، وہ فیکٹری باقاعدہ لائسنس کے ساتھ چلتی ہے۔ جو چیزیں قانونی طور پر بنتی ہیں، وہ تو اپنا کام ہے۔ لیکن کچھ سامان ضرورت کے وقت یہاں بھی آ جاتا ہے میں نے پوچھا، یعنی فارم والا تہہ خانہ عام سامان کے لیے نہیں تھا؟ عطا حسین نے کہا ہا بلکل وہاں کچھ اسلحہ بھی محفوظ رکھا جاتا ہے جگہ نیچے ہے اس لیے نسبتاً محفوظ رہتا ہے میں نے ہلکے سے سر ہلایا۔ جیسے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں اچھا... لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ تہہ خانے میں یہی سامان رکھا جاتا ہے؟ عطا حسین نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، بشیر کی وجہ سے۔ میں نے کہا بشیر؟ عطا حسین نے کہا ہاں۔ فارم بننے کے

بعد میری اس سے اچھی جان پہچان ہوگئی تھی کبھی وہ کام دیکھنے آتا، کبھی میں کسی کام کے سلسلے میں چلا جاتا پھر آہستہ آہستہ دوستی سی ہوگئی میں نے پوچھا یعنی آپ کا اس سے صرف کام کا تعلق نہیں رہا تھا؟ عطا حسین نے کہا نہیں، بعد میں تو کافی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ میں نے پوچھا اچھا، اب بھی بشیر سے رابطہ رہتا ہے؟
عطا حسین نے سر ہلایا کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی ہے تقریباً سال ہوگیا ہے، میں خود فارم کی طرف نہیں گیا۔ میں نے پوچھا، اچھا، اب آپ ان کے لیے کام نہیں کرتے؟ عطا حسین نے سر ہلایا نہیں، اب کافی عرصہ ہوگیا ہے چھوڑے ہوئے میں نے پوچھا، اچانک چھوڑ دیا یا کوئی خاص وجہ تھی؟ نہیں، ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی گھر کے حالات بھی کچھ ایسے ہوگئے تھے کہ سوچا اب کسی کے نیچے کام کرنے کے بجائے اپنا کوئی کام کرلوں میں نے پوچھا، یعنی روزگار کا مسئلہ تھا؟ عطا حسین نے کہا ہاں، مزدوری کا یہی تو مسئلہ ہے۔ کبھی کام ملتا ہے، کبھی کئی دن فارغ بیٹھنا پڑتا ہے۔ گھر کے خرچے اپنی جگہ ہوتے ہیں۔ آدمی کب تک کسی کے کام کا انتظار کرتا رہے؟ میں نے کہا،

تو پھر اپنا کاروبار شروع کر لیا؟ عطا حسین نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، بس، چھوٹا موٹا کھیتی باڑی سبزیوں کا کام شروع کر لیا۔ آمدنی زیادہ نہیں، لیکن کم از کم اپنا کام ہے۔ میں نے سر ہلایا۔ سمجھ سکتا ہوں۔ اپنا کام چھوٹا ہو، پھر بھی آدمی کو اطمینان رہتا ہے۔ عطا حسین نے کہا، بالکل۔ اور پھر عمر بھی ایسی نہیں رہی کہ ہر روز دیہاڑی کے لیے ادھر ادھر پھرتا رہوں۔ میں نے پوچھا اچھا، سردار زارق خان کے بارے میں تو باہر بھی بہت سی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بہت سخت مزاج آدمی ہے۔ آپ نے تو اس کے لوگوں کے ساتھ کام بھی کیا ہے، آپ خود اسے کیسا آدمی سمجھتے ہیں؟ عطا حسین نے کہا لوگ غلط نہیں کہتے۔ آدمی واقعی سخت مزاج ہے اور سچ کہوں تو میرے خیال میں حد سے زیادہ سخت اور شاطر۔ میں نے پوچھا، کیا آپ نے خود کبھی ایسا کوئی واقعہ دیکھا ہے جس کی وجہ سے آپ اسے صرف سخت مزاج نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر سمجھتے ہیں؟ عطا حسین نے چند لمحے سوچا، پھر آہستہ سے بولا، میں نے جو خود دیکھا یا قریب سے سنا ہے، بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں۔ زمینوں کے معاملات میں اس کے لوگوں کا نام آتا رہا ہے کسی کی زمین پر قبضے کی بات ہو، پانی کا رخ بدلنے کا مسئلہ ہو یا کسی کمزور آدمی کا حق دبانے کی بات... ایسی شکایات یہاں نئی نہیں ہیں۔ میں نے پوچھا، اس کے علاوہ؟ کوئی ایسا واقعہ جو آپ نے خود دیکھا ہو؟ عطا حسین نے سر ہلایا۔ نہیں، میرے سامنے ایسا کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوا جس کے بارے میں میں یقین سے کچھ کہہ سکوں۔ میں وہ بات نہیں کہوں گا جو میں نے خود نہیں دیکھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ابھی بھی سردار کے معاملے پر کھل کر بات کرنے سے گریز کر رہا تھا، اس لیے بہتر تھا کہ میں جلدی نہ کروں فلحال ہمارے لیئے اتنی معلومات کافی تھیں میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا، اچھا عطا صاحب، اگر بشیر سے آپ کی اب بھی کبھی کبھار بات ہو جاتی ہے تو اس کا نمبر تو آپ کے پاس ہوگا؟ عطا حسین نے سر ہلایا۔ ہاں، نمبر تو ہے۔

میں نے کہا، اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہمیں بھی دے دیں۔ شاید ہمیں بعد میں کسی بات کی کے لیے اس سے رابطہ کرنا پڑے وہ چند لمحے سوچ کر بولا، ہاں، کوئی مسئلہ نہیں۔ اس نے اپنا موبائل اٹھایا، کچھ دیر اس میں نمبر تلاش کیا اور پھر ہمیں بشیر کا نمبر بتا دیا۔ میں نے نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کر لیا میں نے اٹھتے ہوئے کہا ہم آپ کا زیادہ وقت نہیں لیں گے اگر ضرورت پڑی تو دوبارہ آپ سے بات کریں گے عطا حسین بھی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا جب چاہیں آجائیں عطا حسین سے اجازت لینے کے بعد ہم بیٹھک سے باہر نکل آئے اس نے دروازے تک آ کر ہمیں رخصت کیا۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور گاؤں کی گلی سے نکل کر مین روڈ کی طرف چل پڑے کچھ دیر بعد ہم مین روڈ پر پہنچ گئے سڑک کے کنارے ایک ٹیکسی کھڑی تھی شاہ میر نے ڈرائیور سے شہر جانے کے بارے میں بات کی اور کچھ دیر بعد ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئے کچھ دیر بعد شاہ میر نے خاموشی توڑی۔ تو... کیا ملا؟ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا، چند جگہوں کے بارے میں معلومات اور ایک اہم آدمی کا نمبر، شاہ میر نے میری طرف دیکھا۔ بشیر؟ میں نے سر ہلایا۔ ہاں۔ عطا حسین نے جس انداز میں اس کا ذکر کیا، مجھے لگتا ہے اصل کڑی وہیں سے نکل سکتی ہے شاہ میر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، اور فارم والا معاملہ؟ میں نے جواب دیا، وہ بھی معمولی بات نہیں تہہ خانہ اور وہاں رکھا جانے والا سامان... اور پھر بشیر کا اس جگہ کی نگرانی کرنا لیکن ابھی ہمارے پاس صرف ایک آدمی کی بات ہے۔
شاہ میر نے کہا یعنی تصدیق ضروری ہے۔ میں نے کہا بلکل

شاہ میر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، کم از کم اتنا تو ہوا کہ ہم خالی ہاتھ واپس نہیں جا رہے۔
میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا، خالی ہاتھ؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے لیے تو ایک چھوٹی سی معلومات بھی معمولی نہیں ہوتی۔ کبھی ایک نام، ایک نمبر یا ایک جملہ ہی اگلی پوری کڑی تک پہنچا دیتا ہے۔ شاہ میر نے پوچھا، میجر سعید سے دوبارہ رابطہ کریں گے؟ میں نے کہا ہاں۔ شہر پہنچ کر پہلے انہیں بتائیں گے کہ عطا حسین سے کیا معلوم ہوا پھر دیکھیں گے کہ ان کے پاس پہلے سے موجود معلومات اس سے کہاں ملتی ہیں اور کہاں فرق آتا ہے۔ گاؤں پیچھے رہتا گیا اور راستے میں آبادی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ ہم دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔ عطا حسین سے ہونے والی گفتگو اپنے اپنے ذہن میں دہراتے رہے تقریباً پینتیس، چالیس منٹ کے سفر کے بعد ہم شہر میں داخل ہو گئے۔ شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا اور سڑکوں پر روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ اور مسلسل گفتگو کے بعد ہم دونوں خاصے تھک چکے تھے۔ شاہ میر نے کہا،
''میرا خیال ہے پہلے کسی قریبی ہوٹل میں چل کر کچھ دیر آرام کر لیتے ہیں۔ میں نے سر ہلایا۔ ہاں، آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ ہم ایک قریبی ہوٹل پہنچے، کمرہ لیا اور سامان رکھ کر اندر آ گئے۔ کچھ دیر خاموش بیٹھنے کے بعد شاہ میر نے

کہا، کھانے کا کیا کریں؟ میں نے کہا، یہیں منگوا لیتے ہیں، باہر جانے کی ہمت نہیں رہی۔ کچھ دیر بعد میں نے موبائل نکالا اور میجر سعید کے مخصوص نمبر پر مختصر سا پیغام بھیج دیا میں نے عطا حسین سے ہونے والی ملاقات اور حاصل ہونے والی ابتدائی معلومات کا مختصر ذکر کیا اور صرف اتنا بتایا کہ ہماری طرف سے کام ہو گیا ہے کچھ دیر بعد موبائل پر میجر سعید کا جواب آیا ٹھیک ہے صبح آٹھ بجے کوہ زار ہوٹل میں ملتے ہیں۔ وہیں ناشتہ بھی کر لیں گے اور آرام سے بات بھی ہو جائے گی۔ میں نے پیغام پڑھ کر شاہ میر کی طرف دیکھا۔

کل صبح آٹھ بجے کوہ زار ہوٹل میں ملاقات ہے۔ شاہ میر نے سر ہلایا ٹھیک ہے۔ پھر آج کی معلومات بھی وہیں سامنے رکھ دیں گے میں نے موبائل میز پر رکھتے ہوئے کہا، ہاں، اب دیکھتے ہیں عطا حسین کی باتیں میجر سعید کی معلومات سے کہاں جا کر ملتی ہیں اسی دوران کھانا بھی آ گیا ہم نے کھانا کھایا عشاء کی نماز ادا کی اور اگلی صبح کی ملاقات کے بارے میں مختصر بات کرنے کے بعد آرام کے لیے لیٹ گئے

اگلی صبح میری آنکھ معمول سے کچھ پہلے کھل گئی کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو شہر ابھی پوری طرح جاگا نہیں تھا سڑکوں پر ٹریفک کم تھی اور صبح کی ہلکی روشنی عمارتوں پر پھیل رہی تھی شاہ میر ابھی سو رہا تھا۔ میں کچھ دیر خاموشی سے بیٹھا گزشتہ روز کی گفتگو کو ذہن میں دہراتا رہا عطا حسین کی باتیں بشیر کا نام فارم کے قریب بنا تہہ خانہ اور سب سے بڑھ کر وہ معلومات جن کی ابھی تصدیق ہونا باقی تھی۔ کچھ دیر بعد شاہ میر بھی اٹھ گیا کتنے بجے ہیں؟ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔ میں نے کہا سات بجنے والے ہیں وہ فوراً بستر سے اٹھ بیٹھا اور بولا آٹھ بجے میجر سعید سے ملاقات ہے

میں نے کہا ہاں، بہتر ہے وقت سے پہلے نکلیں ہم نے تیار ہو کر ضروری چیزیں ساتھ لیں اور ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ صبح کی ہوا میں رات کی نسبت کچھ تازگی تھی سڑک پر زندگی آہستہ آہستہ معمول پر آ رہی تھی کچھ دیر بعد ہم کوہ زار ہوٹل پہنچ گئے ہم اندر داخل ہوئے تو لابی میں معمول کی خاموشی تھی میں نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی ابھی ملاقات میں کچھ وقت باقی تھا ہم ایک میز کے قریب جا کر بیٹھ گئے اور میجر سعید کا انتظار کرنے لگے چند منٹ بعد ہوٹل کے دروازے سے ایک شناسا چہرہ اندر داخل ہوا میجر سعید۔

میجر سعید نے ہمیں دیکھا تو ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہماری میز کی طرف بڑھا کافی دیر سے انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟ میں نے اٹھتے ہوئے کہا نہیں، ہم بھی ابھی پہنچے ہیں۔ شاہ میر نے بھی اسے سلام کیا۔ میجر سعید ہمارے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ناشتہ کر لیتے ہیں، پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔

میں نے کہا، بالکل، کل کا دن ویسے بھی خاصا مصروف تھا۔ ناشتے کا آرڈر دیا گیا۔ چند لمحوں تک ہم عام باتیں کرتے

رہے۔ میجر سعید بظاہر پر سکون تھا، لیکن اس کی نظریں بار بار ہماری طرف اٹھ رہی تھیں، جیسے وہ اندازہ لگانا چاہتا ہو کہ عطا حسین سے ملاقات کیسی رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے کپ میز پر رکھتے ہوئے پوچھا،
تو بتایئے، ملاقات کیسی رہی؟ میں نے ایک لمحے کے لیے شاہ میر کی طرف دیکھا، پھر میجر سعید کی طرف متوجہ ہوا۔
ملاقات توقع سے زیادہ مفید رہی۔ میجر سعید نے قدرے سنجیدہ ہو کر پوچھا، کیا ملا؟ میں نے کہا،
کچھ ایسی باتیں جو بظاہر الگ الگ ہیں، لیکن شاید ایک ہی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

وہ خاموش رہا۔ میں نے آہستہ آہستہ عطا حسین سے ہونے والی گفتگو کا ذکر شروع کیا۔ میں نے بشیر کا نام اور اس کا رابطہ نمبر ملنے کی بات بتائی اور یہ کہ تعمیراتی کام وہی دیکھتا ہے، شہر سے باہر پہاڑی کی طرف موجود پرانی عمارت، مرغیوں کا فارم اور وہاں بنایا گیا تہہ خانہ کے بارے میں تفصیل سے بتایا میجر سعید نے درمیان میں ایک بار بھی مداخلت نہیں کی وہ صرف سنتا رہا جب میری بات مکمل ہوئی تو میجر سعید نے گہری سانس لی اور کہا یہ بات نئی نہیں ہے میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا کیا مطلب؟
وہ قدرے آگے جھکا اور دھیمی آواز میں بولا میرے پاس پہلے سے اطلاع تھی کہ زارق خان کے ہتھیاروں کا کچھ ذخیرہ اس کے کسی محفوظ مقام پر رکھا جاتا ہے مسئلہ صرف یہ تھا کہ جگہ کہاں ہے یہ واضح نہیں تھا۔ کبھی اطلاع ڈیرے کے قریب ہونے کی ملتی کبھی کسی الگ احاطے کا ذکر آتا شاہ میر نے فوراً پوچھا، تو عطا حسین کی بات سے جگہ کی تصدیق ہو گئی؟ میجر سعید نے سر ہلایا کافی حد تک خاص طور پر مرغیوں کے فارم اور اس کے نیچے تہہ خانے کی بات نے ایک پرانی اطلاع کو ایک مقام سے جوڑ دیا ہے میں نے پوچھا، کیسی اطلاع؟
اس نے ایک لمحہ توقف کیا
وہاں صرف تہہ خانہ نہیں ہے میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کہا تو پھر؟ میجر سعید نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اب میں تمہیں ایک ایسی بات بتانے جا رہا ہوں جو ابھی تک کسی کو نہیں معلوم وہاں ایک چھوٹا سا قید خانہ بھی ہونے کی اطلاع ہے میرے چہرے پر حیرت نمایاں ہو گئی اور کہا قید خانہ؟ میجر سعید نے کہا "ہاں" میں نے بے اختیار پوچھا، کس لیے؟ میجر سعید نے کہا اطلاع یہی ہے کہ وہاں ایسے لوگوں کو رکھا جاتا ہے جن سے معلومات حاصل کرنا مقصود ہو، یا جنہیں کچھ عرصے کے لیے نظروں سے دور رکھنا ہو بعض اطلاعات میں تشدد کا بھی ذکر ہے لیکن میں اس حصے کی تصدیق کے بغیر اسے حقیقت نہیں کہہ سکتا۔ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھا

لیکن عطا حسین نے تو قید خانے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔
میجر سعید نے سر ہلایا۔ وہ کیوں کرتا؟ اول تو اسے اس بارے میں معلوم ہی نہیں ہو گا اس نے جو کچھ دیکھا، وہی بتایا۔

اسے صرف تہہ خانے اور وہاں موجود اسلحے کے بارے میں علم تھا۔میں نے کہا،اور اگر اسے کسی حد تک اندازہ بھی ہوتا؟میجر سعید نے قدرے سنجیدہ لہجے میں جواب دیاتب بھی وہ ایسی حساس بات آسانی سے زبان پر نہ لاتا۔ ایسے مقامات کے بارے میں عام طور پر وہی لوگ جانتے ہیں جو اندرونی معاملات کے قریب ہوں۔
شاہ میر نے پوچھایعنی آپ کے خیال میں بشیر کو اس بارے میں معلوم ہو سکتا ہے؟

میجر سعید نے فوراً جواب دیااگر وہاں واقعی ایسا کوئی قید خانہ ہے تو بشیر کو سو فیصد اسکا پتہ ہے آخر وہی تو وہاں کے تعمیراتی کاموں کی نگرانی کرتا ہےمیں نے پوچھا،لیکن آپ کو یہ اطلاع ملی کہاں سے؟ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ قید خانہ بھی اسی جگہ ہے؟میجر سعید نے آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا"اپنے ذرائع سے۔ کچھ عرصہ پہلے مجھے ایک خفیہ اطلاع ملی تھی کہ زارق خان کے پرانے ڈیرے کے قریب ایک ایسی جگہ موجود ہے جہاں لوگوں کو کچھ عرصے کے لیے قید رکھا جاتا ہے۔ اطلاع میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ جگہ زیرِ زمین ہے اور کسی محفوظ حصے کے ساتھ منسلک ہے۔میں نے فوراً پوچھا،لیکن یہ تو ابھی بھی صرف اطلاع ہوئی اس کی تصدیق کیسے ہوگی؟میجر سعید نے میری طرف دیکھا یہی مسئلہ ہے۔ اطلاع پہلے سے مضبوط تھی، مگر مکمل تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ جگہ اصل میں کہاں ہے لیکن اب عطا حسین کی بات سے پہلی بار مقام کی ایک واضح کڑی سامنے آئی ہےمیں نے کہا،یعنی تہہ خانے کی موجودگی تقریباً واضح ہوگئی، لیکن قید خانے کی نہیں؟میجر سعید نے کہا" بالکل۔"وہ کچھ لمحے خاموش رہا، پھر بولااگر فارم، تہہ خانہ اور پرانی اطلاع ایک ہی مقام کی طرف اشارہ کر رہے ہیں تو معاملہ بہت اہم ہے۔ لیکن میں صرف اس بنیاد پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ قید خانہ بھی وہیں موجود ہے۔ اس کے لیے الگ تصدیق چاہیے۔"میں نے کہا،تو پھر عطا حسین سے دوبارہ پوچھیں؟میجر سعید نے فوراً سر ہلا دیا۔نہیں۔میں نے کہا"کیوں؟میجر سعید بولا"وہ جتنا جانتا تھا، بتا چکا ہے۔ دوبارہ اسی سوال کے لیے اس کے پاس جانا الٹا نقصان دے سکتا ہے۔ اسے شک ہو جائے گا کہ ہم اس کی باتوں کو کس سمت لے جا رہے ہیں شاہ میر نے آہستہ سے کہا،تو پھر اگلی کڑی بشیر ہے۔میجر سعید نے میز پر رکھے موبائل کی طرف دیکھا۔"ہاں میں نے بشیر کا نمبر اور اسکے گھر کا پتہ جو عطا حسین نے دیااس کے سامنے رکھا۔میجر سعید نے چند لمحے نمبر کو دیکھا، پھر کہا،اب ہمیں بشیر کے گرد گھیرا تنگ کرنا ہوگا۔میں نے پوچھا،"کس طرح؟"میجر سعید نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہااج رات ہم اسکے گھر پہ چھاپا مارینگے۔

میں نے چونک کر کہا،آج رات؟ میجر سعید نے کہاہاں، آج رات۔میں نے کچھ توقف کے بعد کہا،
"،لیکن کیا یہ ذرا جلد بازی نہیں ہوگی؟ ہمارے پاس ابھی صرف چند کڑیاں ہیں۔
میجر سعید نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور دھیمی آواز میں کہا، جلد بازی تب ہوتی جب ہم بغیر معلومات کے قدم

اٹھاتے۔

ہمارے پاس جتنی معلومات موجود ہیں، ان کے بعد مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔''میں نے قدرے سنجیدہ ہو کر کہا، لیکن اگر معاملہ قانونی طریقے سے کرنا ہے تو؟میجر سعید کے چہرے پر سختی آ گئی اور بولا
''ایسے لوگ خود قانون کو کب مانتے ہیں؟ برسوں سے اپنے اثر ورسوخ کے بل پر دوسروں کو خاموش کراتے رہے ہیں۔ ہم کسی کے ساتھ ظلم کرنے نہیں جا رہے، مقصد اسے نقصان پہنچانا نہیں، اسے پوچھ گچھ کے لیے تحویل میں لینا ہے۔''شاہ میر نے پوچھا،اور اگر وہ گھر پر نہ ہوا تو؟میجر سعید ہلکا سا مسکرایا اور بولا تو پلان ختم نہیں ہوگا، صرف بدل جائے گا پلان بی بھی تیار رکھیں گے میں نے کہا''یعنی آج رات موقع نہ ملا تو انتظار کریں گے؟میجر سعید نے سر ہلایا۔ ہاں بلکل،میں نے پوچھا،اور اگر وہ ہمارے ساتھ آنے سے انکار کرے؟میجر سعید چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا،

وہ اتنی آسانی سے ہمارے ساتھ آنے پر آمادہ نہیں ہوگا، یہ بات مجھے بھی معلوم ہے۔ ہم بھی اسے کوئی دعوت دینے تو نہیں جا رہے۔میں نے پوچھا تو پھر؟میجر سعید نے کہا،اس صورتِ حال کے لیے بھی طریقہ موجود ہے لیکن ابھی سے ہر امکان کا اندازہ لگا کر خود کو الجھانے کی ضرورت نہیں فی الحال ہم آج رات والے منصوبے پر چلتے ہیں۔ اگر سب کچھ توقع کے مطابق ہوا تو اسے میری محفوظ رہائش گاہ پر لے جا کر اصل پوچھ گچھ کرینگے۔میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا،''لیکن اگر اسے یہاں، آپ کی رہائش گاہ پر لائے تو؟ کیا اس کے پیچھے لوگ اسے تلاش نہیں کریں گے؟ آخر وہ زارق خان کا خاص آدمی ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا یا وہ واپس نہ گیا تو سوال تو اٹھیں گے۔میجر سعید نے میری طرف دیکھا اور قدرے اطمینان سے مسکرایااور کہاتم اس کی فکر چھوڑ دو۔میں نے کہاکیسے فکر چھوڑوں اگر زارق خان کو پتہ چل گیا کہ اس کا آدمی غائب ہے تو؟میجر سعید نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا
اسے فوراً کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ اور اگر پتہ چل بھی گیا تو اس کے پاس صرف اندازے ہوں گے، ثبوت نہیں ویسے بھی زارق خان کے دشمن کم نہیں ہیں۔ اس کے ارد گرد بہت سے لوگ ایسے ہیں جن سے اس کے اختلافات رہے ہیں۔ اور ہم؟ نہ ہم اس کے دوستوں میں شامل ہیں، نہ دشمنوں میں۔ اس سے ہماری کوئی ذاتی جان پہچان بھی نہیں۔ میں نے پھر پوچھا،اور اگر بشیر نے ہمارے سوالوں کا جواب دینے سے انکار کر دیا؟اس بار میجر سعید کی مسکراہٹ ذرا گہری تھی بولااس کے لیے بھی میرے پاس طریقہ ہے۔ تم بس یہ سمجھو کہ آج رات ہم اسے اپنے سوالوں کے سامنے بیٹھا دیکھنا چاہتے ہیں باقی بات مجھ پر چھوڑ دو۔

میں نے میجر سعید کی طرف دیکھ کر کہا،ٹھیک ہے، پھر پروگرام طے رہامیجر سعید نے سر ہلایاٹھیک ہے، رات آٹھ بجے ملتے ہیں۔ہم نے ناشتہ مکمل کیا اور کچھ دیر بعد اپنی اپنی راہوں پر نکل پڑے۔ ہوٹل سے باہر آ کر میں نے شاہ میر

کو روکا۔ تمہیں ایک کام کرنا ہے۔وہ میری طرف دیکھ کر بولا، کیا؟
میں نے کہا، تقریباً چھ بجے کے قریب بشیر کے گھر کے آس پاس پہنچ جانا۔ بس علاقے کی صورتحال دیکھتے رہنا۔ سات، آٹھ بجے تک اندازہ ہو جائے گا کہ وہ گھر آتا ہے یا نہیں۔شاہ میر نے حیرت سے پوچھا، لیکن میجر سعید کے سامنے یہ بات اپ کیوں نہیں کہی؟میں نے مختصر سا جواب دیا یہ خیال ابھی میرے ذہن میں آیا ہےاگر ہم رات کو اچانک جا کر دروازہ کھٹکھٹا دیں اور وہ گھر پر نہ ہوا، تو پھر جب وہ واپس آئے گا تو گھر والے اسے بتا دیں گے کہ کوئی اس سے ملنے آیا تھا۔ تووہ لازماً سوچے گا کہ کون آیا تھااور کیوں آیا تھا۔ اس کے بعد اگر ہم دوبارہ اس کے پاس جائیں گے تو وہ پہلے ہی محتاط ہو چکا ہوگا۔اسی لیے پہلے صرف صورتحال معلوم کرنی ہے۔ اگر وہ گھر نہ آئے تو ہم انتظار کریں گے۔ اور اگر وہ واقعی گھر آ جائے تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔ پھر ہم میجر سعید کے طے کیے ہوئے طریقے کے مطابق آگے بڑھیں گے۔ اس طرح کم از کم ہمیں یہ یقین تو ہوگا کہ ہم کسی غلط وقت پر قدم نہیں اٹھا رہے۔شاہ میر نے کچھ لمحے سوچا، پھر بولا، ٹھیک ہے، اب بات سمجھ میں آ گئی تو
ابھی کیا کرنا ہے؟میں نے کہا، میں ایک ضروری کام سے پریس کلب جا رہا ہوں کچھ تحریری کام اور رپورٹس بھی مکمل کرنی ہیں، ساتھ ہی ان کے لیے ایک فہرست بھی تیار کی تھی، وہ بھی دیکھ لوں گا۔ شام تک فارغ ہو جاؤں گا۔شام ڈھلنے لگی تھی۔ میں پریس کلب میں بیٹھا اپنی رپورٹس اور ضروری کاغذات دیکھ رہا تھا کہ تقریباً ساڑھے چھ بجے میرے فون پر شاہ میر کا پیغام آیا۔"وہ گھر آ چکا ہے۔"
میں نے فوراً جواب دیا،
"ٹھیک ہے۔ میں اور میجر سعید کچھ دیر میں وہاں پہنچتے ہیں۔ قریب ہی کسی مناسب جگہ پر رک جاؤ اور بس صورتحال پر نظر رکھو۔ اگر وہ دوبارہ باہر نکلے یا کوئی غیر معمولی بات ہو تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔شام کے تقریباً سات بجے میں نے میجر سعید کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس نے چند لمحے خاموش رہ کر بات سنی اور پھر کہا،
"ٹھیک ہے، اب مزید انتظار نہیں کرتے۔"رات پونے آٹھ بجے کے قریب ہم خضدار شہر کے مرکزی حصے سے نکلے۔ سڑک پر اب پہلے کی نسبت رش کم ہو چکا تھا۔ ہم شہر کی آبادی سے نکل کر ایک نسبتاً خاموش علاقے دشتِ گوران کی طرف بڑھنے لگے جہاں بشیر کا گھر تھا۔راستے میں میں نے شاہ میر کو میسج کر دیا کہ وہ اپنی موجودہ جگہ سے زیادہ قریب نہ آئے، بس تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر رہ کر ہماری آمد کا انتظار کرے۔

کچھ دیر بعد ہم اس علاقے دشتِ گوران کے قریب پہنچے۔ شاہ میر پہلے ہی سڑک کے کنارے موجود تھا۔ ہم نے رفتار کم کی، اسے اشارہ کیا اور وہ ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔میجر سعید نے گاڑی آگے بڑھائی اور ہم نے سیدھا بشیر کے گھر جانے کے بجائے پہلے علاقے کا ایک چکر لگایا۔ گلیاں نسبتاً خاموش تھیں۔ چند گھروں کے باہر مدھم روشنیاں

جل رہی تھیں اور سڑک پر کبھی کبھار کوئی گاڑی گزر جاتی۔ چکر مکمل کرنے کے بعد ہم دوبارہ اسی سمت واپس آئے جہاں بشیر کا گھر تھا۔ چند لمحوں بعد ہماری گاڑی اس کے گھر کے مین گیٹ کے بالکل سامنے، جا کر رک گئی۔ گاڑی رکتے ہی ماحول کی خاموشی اور زیادہ نمایاں محسوس ہونے لگی۔ میرے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو گئی۔ اتنی دیر سے جس لمحے کا انتظار تھا، وہ اب ہمارے سامنے تھا۔

میجر سعید نے ایک نظر میری طرف اور پھر شاہ میر کی طرف دیکھا۔ ہم تینوں نے ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھا، جیسے بغیر الفاظ کے ایک ہی بات کہہ رہے ہوں۔

"اللہ خیر کرے،" شاہ میر نے دھیمی آواز میں کہا۔ میں نے بھی بے اختیار سر ہلا دیا۔ ہم نے چہرے عام ماسک سے ڈھانپ لیے تھے۔ میجر سعید نے فیصلہ کیا کہ وہ اکیلا آگے جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک شخص کی موجودگی بشیر کے لیے اتنی غیر معمولی محسوس نہیں ہو گی جتنی ایک ساتھ کئی لوگوں کی۔ وہ گاڑی سے اترا اور گھر کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ شاہ میر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ میں ساتھ والی نشست پر خاموشی سے بیٹھا باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں اب مسلسل میجر سعید کی طرف تھیں۔ وہ گیٹ کے قریب پہنچا، ایک لمحے کے لیے رکا، پھر ہاتھ اٹھا کر دروازہ کھٹکھٹایا۔

چند لمحوں بعد اندر سے دروازہ کھلا۔ سامنے ایک شخص نمودار ہوا اور پوچھا،

کون؟ میجر سعید نے پرسکون لہجے میں کہا، آپ بشیر صاحب ہیں؟ بشیر نے قدرے حیرت سے میجر سعید کو دیکھا اور بولا جی، میں بشیر ہوں۔ میجر سعید نے فوراً کہا،

سردار زارق خان کی طرف سے پیغام ہے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔ بشیر نے چونک کر پوچھا، جی؟ کیا بات ہے؟

میجر سعید نے مختصر انداز میں کہا،" پیغام زبانی ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ میرے ساتھ چلیں، وہاں تفصیل سے بات ہو جائے گی۔ بشیر نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا، جی کدھر، میجر سعید نے جواب دیا، پرانے ڈیرے والے فارم ہاؤس پر۔ بشیر فورا بولا لیکن مجھے تو ایسے کسی پیغام کے بارے میں بتایا نہیں گیا۔

میجر سعید نے پرسکون لہجے میں کہا،" ہمیں بھی ابھی یہی ہدایت ملی ہے

بشیر نے ایک لمحے کے لیے اسے غور سے دیکھا۔ شاید اسے کچھ غیر معمولی محسوس ہوا تھا، اس لیے اس نے قدرے تذبذب سے سر ہلایا اور بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا، "اچھا ٹھیک ہے، میں ذرا گھر کے اندر سے اپنا فون اٹھا لاؤں، پھر چلتے ہیں۔ وہ جیسے ہی اپنا رخ بدل کر گھر کی طرف پلٹا، میجر سعید کی نظر فوراً اس کی اس چالاکی پر پڑی۔ وہ سمجھ گیا کہ بشیر کو شک ہو چکا ہے اور وہ اندر جا کر الرٹ ہونے یا ہتھیار اٹھانے کی کوشش کرے گا اگلے ہی لمحے میجر سعید

شیر کی طرح اس کی پشت پر جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ بشیر کے حلق سے کوئی چیخ نکلتی یا وہ اندر کی طرف بھاگ پاتا، میجر سعید کے بازو کی گرفت نے اس کی شہ رگ پر وہ مخصوص دباؤ ڈالا کہ اس کی سانسیں وہیں رک گئیں۔ بشیر کی آنکھیں چند لمحوں کے لیے پھیلیں اور پھر اندھیرا چھا جانے پر وہ بے سدھ ہو کر میجر سعید کے بازوؤں میں جھول گیا۔ میجر سعید نے بشیر کے بے سدھ جسم کو مضبوطی سے تھاما۔ میں فوراً گاڑی سے نکلا، لپک کر پچھلا دروازہ کھولا اور ہم نے مل کر بشیر کو تیزی سے اندر سیٹ پر دھکیلا۔ میں خود بھی اگلی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند ہی کر رہا تھا کہ شاہ میر نے جو پہلے ہی گاڑی اسٹارٹ کیے الرٹ بیٹھا تھا کلچ چھوڑا گاڑی نے بغیر کوئی آواز کیے اندھیرے میں رفتار پکڑی اور ہم خاموشی سے اس علاقے سے نکل گئے۔

گاڑی کے اندر اب صرف انجن کی ہلکی سی آواز تھی اور ہمارے سانسوں کی تپش۔ شمیر کی نظریں سامنے سڑک پر جمی تھیں، جبکہ میجر سعید پچھلی سیٹ پر بشیر کی نبض چیک کر رہا تھا۔ ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ گردن کے دباؤ کا اثر صرف ایک یا دو منٹ ہی رہتا ہے اور بشیر جلد ہی ہوش میں آ سکتا تھا۔اسی لیے، میجر سعید نے فوراً اپنی جیب سے مخصوص بے ہوشی والا سپرے نکالا اور بشیر کی ناک کے پاس دو تین گہرے اسپرے کیے۔ سپرے کا اثر ہوتے ہی بشیر کا رہا سہا تناؤ بھی ختم ہو گیا اور وہ طویل وقت کے لیے گہری، بے ہوش نیند میں چلا گیا۔ہمارا یہ پہلا اور سب سے نازک مرحلہ کامیابی سے طے ہو چکا تھا۔ اب بشیر پوری طرح ہمارے قابو میں تھا۔شاہ میر نے دشتِ گوران کے کچے راستوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے گاڑی کو ایک سنسان ہائی وے پر ڈال دیا۔ رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور سڑک کے دونوں طرف پھیلی ہوئی ویرانی ہمارے اندر کے تناؤ کو مزید بڑھا رہی تھی۔میجر کے چہرے پر اب بھی وہی روایتی ٹھہراؤ تھا، لیکن ان کی عقابی نظریں مسلسل پچھلے شیشے پر جمی تھیں، جیسے وہ یہ دیکھ رہے ہوں کہ کہیں کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا۔اب رخ کس طرف ہے، میجر صاحب؟" میں نے دھیمی لیکن سنجیدہ آواز میں پوچھا۔میجر سعید نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی، پھر شاہ میر کو مخاطب کرتے ہوئے بولے، "شاہ میر، گاڑی کو بائی پاس کی طرف لے لو۔ ہم شہر کے اندر سے نہیں گزریں گے۔ ہمیں سیدھا میرے اس دوسرے متبادل گھر کی طرف نکلنا ہے، جس کا پلان ہم نے صبح کیا تھا۔ وہاں کوئی ہماری نقل و حرکت پر نظر نہیں رکھ سکتا۔شاہ میر نے بغیر کچھ کہے اسٹیئرنگ کو ایک تیز جھٹکا دیا اور گاڑی ایک پرسکون، تاریک راستے پر مڑ گئی۔ یہ میجر سعید کا وہ ذاتی اور محفوظ ٹھکانہ تھا جس کا ذکر انہوں نے صبح ملاقات کے دوران کیا تھا، جہاں وہ عام سرکاری رہائش سے ہٹ کر اپنی حساس معلومات اور دستاویزات رکھتے تھے۔ تقریباً تیس منٹ کے اس پرسکون لیکن دباؤ سے بھرپور سفر کے بعد، شاہ میر نے گاڑی کی لائٹس مدھم کر دیں اور گاڑی کو میجر سعید کے اس غیر معروف گھر کے عقبی گیٹ کے اندر داخل کر دیا۔ گیٹ بند ہوتے ہی ہم نے سکھ کا سانس لیا۔

میجر سعید نے جھک کر بشیر کی نبض پر دوبارہ ہاتھ رکھا۔ اس کے سانس اب بھی بھاری اور باقاعدہ تھے، سپرے کا اثر ابھی برقرار تھا۔ میں نے تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر کی ٹھنڈی ہوا نے میرے چہرے کو چھوا۔ اب ایک نیا اور زیادہ خطرناک مرحلہ شروع ہونے والا تھا بشیر سے سچ اگلوانے کا مرحلہ۔

میجر سعید اور شاہ میر نے مل کر بشیر کے بے سدھ جسم کو گاڑی سے نکالا ہم تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے اسے میجر سعید کے خفیہ کمرے کے اندر لے گئے۔ گھر کا یہ حصہ بالکل الگ تھلگ اور خاموش تھا، جیسے اسے بنایا ہی ایسے کاموں کے لیے گیا ہو کمرے کے وسط میں لوہے کی ایک بھاری اور مضبوط کرسی لگی ہوئی تھی۔ شاہ میر نے چستی سے کام لیتے ہوئے بشیر کو اس کرسی پر بٹھایا اور موٹی رسیوں کی مدد سے اس کے ہاتھ اور پاؤں کرسی کے پائے کے ساتھ مضبوطی سے جکڑ دیے۔ میجر سعید نے الماری کے اوپر کتابوں کے ہجوم میں ایک چھوٹا سا ہائی ڈیفینیشن خفیہ کیمرہ اس زاویے سے فٹ کر دیا کہ بشیر کا چہرہ اور اس کی ہر جنبش صاف ریکارڈ ہو سکے۔ اب سب کچھ تیار تھا اور ہماری نظریں بشیر پر جمی تھیں، جو اب آہستہ آہستہ ہوش کی دنیا میں واپس آ رہا تھا۔ شاہ میر نے میز پر رکھا ہوا ٹھنڈے پانی کا مگ اٹھایا اور ایک ہی جھٹکے سے بشیر کے چہرے پر مارا۔ بشیر نے ایک زوردار جھرجھری لی۔ پانی کے شدید جھٹکے نے اسے ہوش کی دنیا میں لا پٹکا۔ اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھ اور پاؤں ہلانے کی کوشش کی، لیکن مضبوط رسیوں نے اسے کرسی سے ہلنے بھی نہ دیا۔ اس نے جھپکتی ہوئی آنکھوں سے سامنے دیکھا، جہاں ہم تینوں کالے چہرے والے ماسک پہنے، کسی جلاد کی طرح اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ کمرے کی مدھم لائٹ میں ہمارے صرف مہیب سائے نظر آ رہے تھے۔ بشیر نے خوف اور غصے کے ملے جلے تاثر کے ساتھ جھٹکے سے سر اٹھایا اور ہکلا کر پوچھا، "کون... کون ہو تم لوگ؟ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" ہم تینوں خاموش رہے، ہمارا یہ سکوت اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہا تھا۔ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے، میجر سعید نے پہلے ہی سے بنا ہوا نفسیاتی دباؤ کا جال اس پر پھینک دیا۔ میجر سعید کرسی سے اٹھے، ان کا لہجہ انتہائی کڑکدار اور سرد تھا، "بشیر! ہمارے بارے میں پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارے سردار زارق کے بارے میں، اسکی مستونگ والی اسلحہ فیکٹری، پرانے ڈیرے کے ساتھ بنے مرغی فارم اور اس کے نیچے بنے خفیہ تہہ خانے کے بارے میں سب کچھ پہلے ہی جانتے ہیں۔ اس لیے ہمارے سامنے جھوٹ بولنے کی ذرا بھی کوشش مت کرنا۔ جو جو پوچھتے جائیں، سچ سچ بتاتے جانا۔" میجر سعید نے ایک قدم آگے بڑھایا، اپنی پشت سے نائن ایم ایم پستول نکالا اور اس کا سرد نال سیدھا بشیر کی پیشانی پر ٹکا دیا۔ پستول کے لاک کھینچنے کی کلک نے کمرے کی خاموشی کو چیر دیا۔

وگرنہ..." میجر سعید نے دھیمی لیکن ہولناک آواز میں کہا،وگرنہ میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہہ رہا ہوں تمہاری اس کھوپڑی میں ایسی کھڑکیاں کھولوں گا کہ سوچنے سمجھنے کی مہلت بھی نہیں ملے گی، اور یہاں تمہاری لاش غائب کرنے میں مجھے ایک سیکنڈ کی دیر بھی نہیں لگے گی اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم یہاں سے زندہ جانا چاہتے ہو یا لاش بن کر۔ اب بولو، کیا ارادہ ہے؟۔بشیر نے خشک حلق کے ساتھ تھوک نگلا۔ پستول کی نال کی سردی، اور میجر سعید کی اللہ کی قسم اس پورے نفسیاتی سحر نے بشیر کے اعصاب کو پوری طرح مسمار کر دیا۔ وہ خود ایک شاطر مجرم تھا، اس لیے منٹوں میں سمجھ گیا کہ وہ واقعی ایسے خطرناک لوگوں کے ہتھے چڑھا ہے جو اس کے پورے نیٹ ورک سے واقف ہیں۔ موت کو اپنے بالکل سامنے دیکھ کر اس کا رعب خاک میں مل گیا، اس نے تھوک نگلا اور تھرتھراتی آواز میں سودے بازی پر اتر آیا۔"اگر... اگر میں سب سچ بتا دوں، تو کیا تم لوگ مجھے زندہ چھوڑ دو گے؟ مجھے یہاں سے جانے دو گے؟"بشیر نے کانپتی آواز میں پوچھا۔ ماسک کے پیچھے سے میجر سعید کی آنکھوں میں ایک گہری چمک ابھری۔ انہوں نے پستول کا دباؤ ذرا سا کم کیا لیکن لہجہ وہی کڑکدار رکھا، "ہاں، ہم تمہیں بالکل چھوڑ دیں گے۔ کیونکہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد تم اپنے سردار کے پاس جا کر یہ کبھی نہیں بتاؤ گے کہ تمہیں کسی نے اغوا کیا تھا اور تم سے تفتیش ہوئی تھی۔ اگر تم نے اسے ذرا بھی بھنک لگنے دی کہ تم نے ہمارے سامنے منہ کھولا ہے، تو وہ سردار تمہیں خود اپنے ہاتھوں سے مار دے گا۔ اس لیے تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ جو ہم پوچھیں، وہ بتاؤ اور یہاں سے چپ چاپ نکل جاؤ۔"اگر تم ہمارے ساتھ پورا تعاون کرو گے تو یہ ہمارا تم سے وعدہ ہے کہ ہم تمہیں بالکل صحیح سلامت یہاں سے جانے دیں گے،" میجر سعید نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اور یاد رکھو، ہم اپنا وعدہ کبھی نہیں توڑتے۔ہم یہاں تمہاری جان لینے نہیں آئے، ہمارا مقصد صرف سچ معلوم کرنا ہے۔ لیکن اگر تم نے جھوٹ بولا، تو اگلا سیکنڈ تمہاری زندگی کا آخری سیکنڈ ہوگا۔"

بشیر نے بے اختیار تیزی سے سر ہلایا۔ اس کا پورا جسم خوف سے کانپ رہا تھا اور ماتھا پسینے سے شرابور تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اب اس کے پاس بچنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے کہ وہ سچ بول دے۔بشیر! اب جیسے پوچھوں، ویسے جواب دو۔ وقت ضائع کیے بغیر،" میجر سعید نے سرد آواز میں کہا۔ "پرانے ڈیرے کے نیچے جو مرغیوں کا فارم ہے، اس کے نیچے تہہ خانہ بنا ہوا ہے؟ ہاں یا ناں؟"جی... جی ہاں، بنا ہوا ہے" بشیر نے تھوک نگلتے ہوئے جلدی سے کہا۔"اس تہہ خانے کا حجم کتنا ہے اور اس میں کتنے کمرے ہیں؟"وہ کافی بڑا ہے ... چھ بڑے شیڈز کے نیچے پھیلا ہوا ہے، اس میں تین بڑے ہال ہیں اور ایک طرف دو چھوٹے کمرے ہیں

میجر سعید نے اگلا سوال داغاہمیں معلوم ہے کہ وہاں اسلحہ آتا ہے میرے پاس اس کی ایک ایک منٹ کی رپورٹ موجود ہے۔ اب مجھے سیدھا جواب دو، وہاں جتنا بھی اسلحہ لایا جاتا ہے،چاہے وہ قانونی ہو یا غیر قانونی اسے کہاں اور کیسے چھپایا جاتا ہے؟ بشیر خوف کے مارے ہکلا کر بولا،ہماری مستونگ والی فیکٹری کاجو قانونی مال(اسلحہ) ہوتا ہے، اسے تو ہم اوپر

شیڈز اور گودام میں سامنے رکھتے ہیں تاکہ اگر کوئی چیکنگ کے لیے بھی آئے تو اسے سب کچھ قانونی لگے اور کسی کو شک نہ ہو۔ لیکن جو غیر قانونی اسلحہ ہوتا ہے، اسے چھپانے کے لیے ہم نے اس عام تہہ خانے کے بھی نیچے ایک اور خفیہ حصہ بنایا ہوا ہے۔ وہ سارا کالا مال وہاں زمین کے بہت نیچے چھپا کر رکھا جاتا ہے، جس کا فیکٹری کے سرکاری ریکارڈ میں کوئی ذکر نہیں ہوتا۔

میجر سعید کا سوال: بشیر اب مجھے یہ بتاؤ کہ یہ سارا غیر قانونی اسلحہ کہاں سے اور کیسے آتا ہے؟ خبردار جو جھوٹ بولنے کی کوشش بھی کی ہمارے پاس سرحد پار سے لے کر تمہارے اس اڈے تک کی مکمل تفصیل موجود ہے کہ یہ مال کس کے اشارے پر تم تک پہنچتا ہے۔

بشیر کا جواب: یہ سارا غیر قانونی مال بھارت سے آتا ہے گجرات کے ساحل کی طرف سے اور ممبئی کے مضافات کی ویران گودیوں سے بڑی اسمگلنگ لانچوں پر یہ جدید مال لوڈ کر کے بھیجا جاتا ہے وہ کشتیاں وہاں سے نکلتی ہیں اور بحیرہ عرب کے بالکل وسط میں (کھلے اور بین الاقوامی پانیوں) میں آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں

میجر سعید کا سوال: کھلے پانیوں میں کھڑے ہونے کے بعد وہ مال تمہارے قبضے میں کیسے آتا ہے؟ تلاشی سے کیسے بچتے ہو؟بشیر کا جواب: وہاں مسقط اور دبئی کے نیٹ ورکس کے ذریعے ہمارے ملاحوں کو سیٹلائٹ فون پر جی پی ایس لوکیشن ملتی ہے۔ سردار زارق خان کی مچھلی پکڑنے والی بڑی کشتیاں جن کے پاس سمندر کا قانونی لائسنس ہوتا ہے وہ رات کے گھپ اندھیرے میں کھلے سمندر میں ان بھارتی لانچوں سے ملتی ہیں۔ وہاں بغیر کوئی لائٹ جلائے، منٹوں میں سارا اسلحہ ہماری کشتیوں میں منتقل کیا جاتا ہے اور ملاح اس کے اوپر ٹنوں کے حساب سے مچھلیاں اور برف ڈال دیتے ہیں۔

میجر سعید کا سوال کوسٹ گارڈز اور نیوی کے پاس جدید اسکینرز ہوتے ہیں، وہ مچھلیوں کے نیچے چھپا لوہا پکڑ سکتے ہیں ان کی تلاشی سے کیسے نکلتے ہو؟بشیر کا جواب: ہمارے ملاح کسی باقاعدہ بندرگاہ یا پورٹ پر جاتے ہی نہیں جہاں اسکینرز ہوں! وہ رات کی تاریکی میں پسنی اور اورماڑہ کی ان ویران اور پتھریلی کھاڑیوں (Creeks) پر کشتیاں لگاتے ہیں جہاں دور دور تک کوئی چوکی نہیں ہوتی وہاں ساحل پر سردار زارق خان کی فیکٹری کے وہ بند ٹرک پہلے سے تیار کھڑے ہوتے ہیں جن کے پاس ملک بھر میں اسلحہ لانے لے جانے کے آفیشل سرکاری پرمٹس موجود ہیں۔

میجر سعید کا سوال: روڈ پر موجود سیکیورٹی چیک پوسٹوں اور میٹل ڈیٹیکٹرز کو کیسے دھوکہ دیتے ہو؟بشیر کا جواب: ان ٹرکوں کے اندر میں نے خود کھڑے ہو کر خفیہ خانے بنائے ہیں جن کے اندرونی حصوں پر لیڈ (سیسے) کی موٹی تہیں چڑھا دی جاتی ہیں تاکہ کوئی اسکینر اندر نہ دیکھ سکے۔ اوپر فیکٹری کا قانونی لوہا اور اسکریپ لاد دیا جاتا ہے۔ جب چیک

پوسٹ پر اہلکار میٹل ڈیٹیکٹر مارتے ہیں اور بیپ کی آواز آتی ہے تو ڈرائیور فیکٹری کا پرمٹ دکھا کر کہتا ہے کہ گاڑی میں تو خام لوہا لدا ہے۔ اہلکار پرمٹ دیکھ کر گاڑی کو بغیر تفصیلی تلاشی کے کلیئر کر دیتے ہیں۔ یہ گاڑیاں سیدھی پرانے ڈیرے کے قریب مرغیوں کے فارم ہاؤس پر آتی ہیں اور مال اس گہرے تہہ خانے میں اتار دیا جاتا ہے۔میجر سعید کا سوال: وہاں سے آگے یہ مال کن کو اور کیسے بیچا جاتا ہے؟

بشیر کا جواب، یہ مال یہاں گراؤنڈ پر صرف اور صرف کالعدم تنظیموں کو ہی بیچا جاتا ہے ان تنظیموں کے کارندے اور کمانڈرز خود رات کی تاریکی میں چپ چاپ ہمارے پرانے ڈیرے پر آتے ہیں نقد رقم کی شکل میں ادائیگی کرتے ہیں اور اپنے ہتھیار لے کر چلے جاتے ہیں۔

میجر سعید کا سوال: اچھاتو یہ غیر قانونی مال تم لوگ صرف بھارت سے لیتے ہو یا کسی اور ملک یا نیٹ ورک سے بھی آتا ہے؟بشیر کا جواب: صرف بھارت سے یہ پورا مال صرف وہیں سے آتا ہے۔

میجر سعید کا سوال: صرف بھارت ہی سے کیوں؟ کسی اور سے کیوں نہیں؟بشیر کا جواب:اس لیے کہ وہاں سے یہ جدید ہتھیار بالکل سستے داموں مل جاتے ہیں اور سردار زارق خان آگے کالعدم تنظیموں کو اسے مہنگے داموں بیچ کر کروڑوں روپے کماتا ہے۔

جب اسلحے والی بات پوری طرح واضح ہو گئی اور بشیر نے خود اعتراف کر لیا کہ قانونی مال (اسلحہ) صرف ایک ڈھال ہے، تو اب میجر سعید نے تفتیش کا رخ اس کے دوسرے اور سب سے ہولناک حصے کی طرف موڑا۔ چلو، اسلحے کا حساب تو ہو گیا، میجر سعید نے اپنی آواز کو مزید سرد اور مہیب بناتے ہوئے پوچھا۔ اب اس دوسرے حصے پر آؤ۔ ان دو چھوٹے کمروں کے ساتھ جو تیسرا خفیہ حصہ منسلک ہے، وہ قید خانہ ہے؟ ہاں یا ناں؟"بشیر نے ایک لمحے کے لیے ہچکچانا چاہا، لیکن میجر سعید کی انگلی جیسے ہی پستول کے ٹریگر پر ہلکی سی ہلی، اس نے گھبرا کر سر ہلایا، جی ہاں! جی ہاں، وہ قید خانہ ہی ہے۔"میجر سعید نے پوچھا کس مقصد کے لیے بنایا گیا ہے وہ؟ وہاں کس کو رکھا جاتا ہے؟"بشیر نے خوف سے کانپتے ہوئے جواب دیا۔وہ سردار زارق خان کی نجی جیل ہے۔ سردار اپنے مقامی مخالفین، زمینوں کے تنازعات میں پھنسے لوگوں یا اپنے قبیلے کے ان افراد کو وہاں لاتا ہے جو اس کی مرضی کے خلاف چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ قید خانہ صرف ان مقامی لوگوں پر تشدد کرنے اور انہیں اپنے قابو میں رکھنے کے لیے بنایا گیا ہے تاکہ علاقے میں سردار کا خوف اور رعب قائم رہے۔ زارق خان خود یا اس کے خاص کارندے وہاں جا کر ان سے اپنے حساب کتاب برابر کرتے ہیں۔اور اس قید خانے کی نگرانی کون کرتا ہے؟ وہاں کون بیٹھتا ہے؟میجر سعید نے اگلا کڑکدار سوال داغا۔ بشیر نے جواب دیا وہاں سردار کا سب سے خاص اور وفادار آدمی بیٹھتا ہے... کامران بلوچ! وہی اس قید خانے کا انچارج ہے اور اندر کے سارے معاملات وہی دیکھتا ہے۔

میجر سعید کا سوال:بشیر یہ سب تو تمہارا زبانی بیان ہے لیکن ہمیں اس پورے گورکھ دھندے کے پکے ثبوت بھی تو

چاہیے نا؟ کیا ثبوت ہیں تمھارے پاس؟بشیر کا جواب: اس بیرونی رابطے، فنڈنگ اور اسلحے کی خرید و فروخت کا کوئی بھی کاغذی ثبوت میرے پاس نہیں ہے وہ سارے پکے دستاویزی ثبوت، فائلیں صرف اور صرف کامران بلوچ کے پاس ہی ہوتی ہیں۔

میجر سعید کا سوال: اگر تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے تو ہم کیسے یقین کر لیں کہ تم اپنی جان بچانے کے لیے یہ من گھڑت کہانی نہیں سنا رہے؟ ہم کیسے مانیں کہ حقیقت یہی ہے؟

بشیر کا جواب:اس وقت میری پیشانی پر آپ کا لوڈڈ پستول ٹکا ہوا ہے موت کے اتنے قریب کھڑا ہو کر کوئی انسان جھوٹ بولنے کا خطرہ نہیں مول لیتا یہ اب آپ پر ہی منحصر ہے کہ آپ میری بات پر یقین کریں یا نہ کریں لیکن سچ یہی ہے کہ میں اس پورے کھیل میں صرف ایک تنخواہ دار کاریگر ہوں۔ میرا کام صرف گاڑیوں کے خفیہ خانے بنانا تعمیراتی کام دیکھنا ہے جس کے مجھے پیسے ملتے ہیں بڑے لوگ اپنی دستاویزات اور ثبوت مجھ جیسے معمولی بندے کے سامنے کیوں رکھیں گے؟

میجر سعید کا سوال: اگر تم صرف ایک معمولی تنخواہ دار کاریگر ہو، تو تمہیں اس پورے نیٹ ورک، کھلے سمندر کے روٹس، گجرات اور کالعدم تنظیموں کی ڈیلنگ کی اتنی گہری معلومات کیسے حاصل ہو گئیں؟بشیر کا جواب: آخر میں رہتا تو انہی لوگوں کے درمیان ہوں نا کامران بلوچ سردار کا سب سے خاص بندہ ہے، لیکن وہ میرا بہت اچھا اور گہرا دوست بھی ہے، ہم بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ جب ہم پرانے ڈیرے پر بیٹھتے تھے تو وہ باتوں باتوں میں اکثر میرے سامنے یہ سب اگل دیتا تھا مجھے زبانی سب پتہ ہے کیونکہ میں نے اپنی آنکھوں سے مال اترتے دیکھا ہے، لیکن مجھے ان کی دستاویزات کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی، اس لیے وہ سب کامران کے پاس ہی محفوظ ہیں۔

میجر سعید کا سوال: ٹھیک ہے بشیر تو پھر اب ہمارے پاس اس کھیل کو ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ بچتا ہے۔ تمہیں ہمارے ساتھ پورا تعاون کرنا ہوگا اور کامران بلوچ کو پکڑوانے میں ہماری مدد کرنی ہوگی اگر تم نے اسے ہمارے جال میں پھنسوا دیا، تو یہ ہمارا تم سے پکا وعدہ ہے کہ ہم تمہیں بالکل صحیح سلامت یہاں سے جانے دیں گے اور تمہیں ہاتھ تک نہیں لگائیں گے بولو، کیا کہتے ہو؟بشیر کا جواب: کیسا تعاون؟ مجھے کیا کرنا ہوگا؟

میجر سعید کا سوال :سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ کامران بلوچ اس وقت خضدار میں کہاں ہے؟ وہ روزانہ کون سا روٹ استعمال کرتا ہے اور اپنے گھر سے پرانے ڈیرے (مرغی فارم) کی طرف کس طرح اور کس وقت جاتا ہے؟

بشیر کا جواب:اس کا ذاتی گھر خضدار شہر کے اندر ہی ہے اور وہ روزانہ صبح اٹھ بجے کے قریب وہاں سےاپنی گاڑی پر نکلتا ہے۔ ڈیرے کی طرف جانے کے لیے وہ خضدار بائی پاس والا مین روٹ استعمال کرتا ہے۔

میجر سعید ٹھیک ہے بشیر پھر پلان یہ ہے کہ صبح تم ساڑھے چھ بجے کامران بلوچ کو کال کرو گے اور کہو گے کہ کوئٹہ سے میرے دو بہت خاص مہمان آئے ہیں جن کا زمین کا بڑا مسئلہ ہے اور وہ اس وقت بائی پاس روڈ کے بالکل درمیان بنے المیزان ہوٹل پر بیٹھے ناشتہ وغیرہ کر رہے ہیں۔ تم جب آٹھ بجے ڈیرے کے لیے نکلو گے تو راستے میں ہوٹل سے انہیں لازمی اپنی گاڑی میں لیتے جانا اور سیدھا پرانے ڈیرے پر پہنچا دینا کیونکہ میں خود کسی ضروری کام کے سلسلے میں خضدار سے باہر گیا ہوا ہوں اور دوپہر تک واپس ڈیرے پر پہنچوں گا باقی کی بات چیت میں وہاں پہنچ کر خود کر لوں گا۔ تم کامران بلوچ سے بالکل اسی انداز میں بات کرو گے سمجھ گئے؟بشیر کا جواب: جب کامران بلوچ وہاں آئے گا اور آپ لوگ اسے دبوچ لیں گے، تو وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ میرے بھائی جیسے دوست نے مجھے دھوکہ دیا ہے وہ بعد میں میرے لیے بہت بڑا مسئلہ کھڑا کر دے گا، میں اپنے جگری دوست کو یوں سیدھا پھندا نہیں لگا سکتا کوئی ایسا طریقہ کریں کہ اسے مجھ پر شک نہ ہو۔

میجر سعید مسکراتے ہوئے بولا بشیر ہمیں یہ بچوں والی کہانیاں اور فلمی وفاداری کے قصے سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر اپنی زندگی خیر چاہتے ہو تو جیسا ہم کہہ رہے ہیں، ویسا ہی کرو۔ یہ تمہاری بقا کا آخری موقع ہے۔ اور رہی بات تمہارے اس بھائیوں جیسے یارانے کی، تو ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جرائم کی اس کالی دنیا میں کوئی کسی کا سگا نہیں ہوتا تم دونوں بظاہر سردار زارق خان کے وفادار ہو اور اس کے نیٹ ورک سے لاکھوں کماتے ہو، لیکن تم دونوں آپس میں مل کر زارق خان سے چھپ کر بھی اسلحے کا کوئی نہ کوئی پرائیویٹ سودا یا چوری لازمی کرتے ہو گے جس کا علم سردار زاراق خان کو بھی نہیں ہوتا۔ ہم بھی یہی کام کرتے ہیں بشیر ہمیں مجرموں کی رگ رگ کا پتہ ہے جب کامران ہمارے ہاتھ آئے گا، تو ہم اس سے بھی صرف وہی دستاویزی ثبوت لیں گے اور بعد میں اسے بھی چھوڑ دیں گے تم دونوں بعد میں بیٹھ کر آپس میں جو مرضی ڈیل کر لینا، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔
بشیر خوف اور بے بسی سے تھوک نگلتے ہوئے بولا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اپنی جان کے آگے واقعی کوئی رشتہ نہیں ٹکتا میں تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں، جو آپ کہیں گے میں وہی بولوں گا

میجر سعید دھیمے لہجے میں بولے بہت خوب بشیر بس اب جیسے سمجھایا ہے صبح ٹھیک ساڑھے چھ بجے ویسے ہی بات ہونی چاہیے۔ لہجے میں ذرا سا بھی تناؤ آیا تو اس کے نتائج تم خود بھگتو گے فی الحال تم یہیں آرام کرو۔ ہم تینوں نے اپنے ماسک درست کیے کمرے کی لائٹ بند کی، بشیر کو اسی اندھیرے کمرے میں بند چھوڑا اور خاموشی سے باہر چھوٹے ہال میں آ گئے۔ میجر سعید نے دروازے کو باہر سے ایک مضبوط تالا لگا دیا۔ باہر آتے ہی ہم نے اپنے ماسک اتارے۔ حبس زدہ ماحول کے بعد ہال کی تازہ ہوا نے ہمارے اعصاب کو کچھ راحت دی۔ ہم تینوں ہال سے گزرتے ہوئے برابر

والے دوسرے کمرے میں چلے گئے اور کرسیوں پر بیٹھ کر اگلی حکمتِ عملی پر بات کرنے لگے۔میں نے اپنی قمیض کی آستینیں اوپر چڑھاتے ہوئے گہری سانس لی اور میجر سعید کی طرف دیکھ کر کہا میجر صاحب! کمال ہو گیا ہے۔ سچ پوچھیں تو یہ بشیر تو بہت ہی آسان ہدف ثابت ہوا۔ مجھے تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ یہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے پورا نیٹ ورک اگل دے گا۔میجر سعید کے چہرے پر ایک تجربہ کار اور سرد مسکراہٹ ابھری۔ انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور دھیمی آواز میں بولے، ذیشان یہ ڈیڑھ لاکھ روپے کا ایک ملازم ہے۔ جب ایسے مجرموں کے ماتھے پر لوڈڈ نائن ایم ایم (9mm) کی نال ٹکراتی ہے نا، تو ان کی ساری وفاداریاں اور بھائی چارے سیکنڈوں میں ہوا ہو جاتے ہیں ان کی دنیا کا یہ تلخ سچ ہے کہ یہاں کوئی کسی کا سگا نہیں ہوتا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اگلی بات چیت شروع کرتے ہوئے پوچھا، صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔ لیکن اب اصل مرحلہ صبح کا ہے۔ صبح کا ہمارا کیا پلان ہو گا؟ ہم کامران بلوچ کو بائی پاس پر کس طرح دبوچیں گے؟میجر سعید نے کہا، صبح کا پلان بالکل سیدھا ہے بشیر ساڑھے چھ بجے کال کر کے اسے المیزان ہوٹل پر انے کا کہہ دے گا وہاں کامران بلوچ کو دبوچنے کے لیے ہم دو شاہ میر اور میں جائیں گے صبح سویرے عام بلوچی لباس اور چادریں اوڑھ کر المیزان ہوٹل کے باہر کوئٹہ کے مہمان بن کر کھڑے ہوں گے۔میں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر میجر سعید کی طرف دیکھ کر اپنا موقف سامنے رکھا،میجر صاحب یہ پلان بالکل ٹھیک ہے شاہ میر اور اپ دونوں فیلڈ کے پکے جوان ہیں اس لیے اپ دونوں کا جانا ہی سب سے بہترین رہے گا میں اس دوران پیچھے اسی محفوظ گھر پر ہی رہوں گا تاکہ بشیر پر نظر رکھی جا سکے۔میجر سعید نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا، ٹھیک ہے ذیشان تمہارا پیچھے رہنا ہی بہتر ہے تم یہاں بیک اپ سنبھالو گے شاہ میر اور میں گاڑی لے کر ساڑھے چھ بجے ہی نکل جائیں گے تاکہ کامران کے پہنچنے سے پہلے ہوٹل کے ماحول کا جائزہ لے سکیں۔ہم نے اسی انداز میں صبح کا پورا ایکشن پلان ترتیب دیا جب ہر کڑی اپنی جگہ بیٹھ گئی اور ڈیوٹیاں پکی ہو گئیں، تو ہم نے اپنی گفتگو ختم کی۔ گھڑی کی سوئیاں رات کے آخری پہر کا پتہ دے رہی تھیں اور چند گھنٹوں بعد ایک بہت بڑا معرکہ شروع ہونا تھا ہم تینوں اپنے اپنے بستروں پر جا کر لیٹ گئے اور نہ جانے کب نیند کی اغوش میں چلے گئے۔

میں نے اپنی انویسٹی گیشن فائل کو عقیدت سے دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا، اور دیکھو شاہ میر نظام کی سب سے بڑی ستم ظریفی اور منافقت دیکھو... آج وہ پنجاب میں سرکاری مہمان بن کر ایوارڈ بھی لے رہا ہے ادھر وہ اسٹیج پر ٹھاٹھ سے بیٹھ کر تمغے سمیٹ رہا ہے اور ادھر یہاں خضدار میں اس کا بچھایا ہوا بارود ہماری اپنی مٹی کو خون سے نہلا رہا ہے لیکن انشاء اللہ، یہ اس کی زندگی کا آخری ایوارڈ ہو گا۔ اب وہ بہت جلد قانون اور مکافاتِ عمل کے ایسے گھیرے میں ہو گا

جہاں سے نکلنا اس کے بس میں نہیں رہے گا۔ میری بات سن کر میجر سعید کے چہرے پر ایک گہرا اور جلال بھرا اطمینان ابھر آیا۔ انہوں نے میز پر رکھی اپنی مہر بند انٹیلیجنس رپورٹ پر ہاتھ جمایا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک پُر عزم لہجے میں کہا حکمتِ عملی یہی کہتی ہے ذیشان کہ دشمن کو اس وقت مارو جب وہ خود کو سب سے زیادہ محفوظ سمجھ رہا ہو۔ بے شک زارق خان اس وقت ایوارڈ پا کر جشن منا رہا ہوگا لیکن اسکے وہم و گمان بھی نہیں ہوگا کہ خضدار کے ایک اندھیرے کمرے میں بیٹھ کر ہم اس کا پورا قلعہ مسمار کر چکے ہیں۔ میری انٹیلیجنس رپورٹ اور تمہارا یہ قلم... اب ایک بم بن چکے ہیں، جسکا فیوز کل صبح کینٹ میں لگے گا اور پھر وہ دھماکہ ہوگا جس کی گونج اسلام اباد تک سنی جائے گی

اسی اہم گفتگو پر ہم کافی دیر تک میز پر جھکے رہے اور آنے والے آپریشن کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی پلان بناتے رہے۔ نقشوں، راستوں اور ممکنہ خطرات کا جائزہ لیتے لیتے وقت کا اندازہ ہی نہ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے شام ڈھل گئی۔ دور مسجد سے جیسے ہی مغرب کی اذان بلند ہوئی، ہم نے اپنے کاغذات سمیٹے۔ وہیں کمرے میں مغرب کی نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے شام کا کھانا منگوایا۔ ہم تینوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے، کیونکہ دماغ اب بھی اگلے دن کے مشن کی کڑیوں کو جوڑنے میں مصروف تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم نے ارام کرنے کا فیصلہ کیا دن بھر کی ذہنی تھکن اور اگلے دن کے بڑے چیلنج کو سامنے رکھتے ہوئے، ہمارے لیے تازہ دم ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ، ہم اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے اور جلد ہی گہری نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

چھٹا باب۔۔۔۔۔۔آدھی رات کا محاصرہ

اگلے دن جب ہماری آنکھ کھلی تو خضدار کی خاموش فضاؤں میں فجر کی پہلی اذان گونج رہی تھی۔ رات کی چند گھنٹوں کی پر سکون نیند نے ہماری دن بھر کی ذہنی تھکن کو کافی حد تک کم کر دیا تھا لیکن دلوں میں موجود سسپنس اور تناؤ اب بھی برقرار تھا۔ ہم تینوں اپنے اپنے بستروں سے اٹھے، وضو کیا اور کمرے کے ایک کونے میں جائے نماز بچھا کر اللہ کے حضور فجر کی نماز ادا کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے ہلکا پھلکا ناشتہ کیا پھر جیسے ہی گھڑی کی سوئیوں نے صبح کے سات بجنے کا اشارہ کیا میجر سعید نے اپنی مہر بند انٹیلیجنس رپورٹ کا بریف کیس مضبوطی سے تھاما اور الوداعی نظر ہم پر ڈالی۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چٹانی سختی اور عزم کی جھلک تھی۔

وہ گاڑی کی طرف بڑھے، اس کا دروازہ کھول کر سیٹ پر بیٹھے اور پھر میری طرف دیکھ کر دھیمے مگر پُر عزم لہجے میں کہنے لگے، ٹھیک ہے ذیشان، تم نے جو اپنی رپورٹیں دیکھنی ہیں، انہیں ادھر ہی محفوظ رہ کر دیکھو۔ اج کا دن یہیں رکو اور اپنے کام مکمل کرو۔ شام کو جب میں کینٹ سے واپس آؤں گا، تو پھر وہاں کی جو بھی بات یا صورتحال ہو گی، وہ تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا اور پھر ہم مل کر اگلے دن کا باقاعدہ پلان طے کریں گے۔

میں نے ان کی سنجیدگی کو سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا، ٹھیک ہے میجر صاحب آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میں آج باہر کہیں نہیں نکلوں گا۔ ویسے بھی میرے کچھ بہت ضروری کام ادھورے پڑے ہیں۔ میں نے پچھلے چند دنوں میں جو انٹرویو کیے اور رپورٹیں تیار کی تھیں،ان پر کام کرنا ہے۔ یہاں خضدار اور بلوچستان کے دیگر علاقوں میں جو ہیومن رائٹس (انسانی حقوق) کے سنگین مسائل ہیں،ان پر میں نے ایک دو تفصیلی آرٹیکل بھی لکھنے ہیں۔ میں ان کا ڈیٹا ترتیب دوں گا تاکہ جیسے ہی آپ وہاں سے کلیئرنس لائیں، ہمارا بیک اینڈ پلان بھی تیار ہو۔ آپ بس جیسے ہی کوئی

صورتحال ہو، مجھے لازمی بتائیے گا۔وہ ہم سے الوداعی ہاتھ ملا کر سیف ہاؤس سے نکل گئے اور گاڑی کا انجن ایک بھاری گرج کے ساتھ انہیں کینٹ کی طرف لے کر روانہ ہو گیا۔ان کے جانے کے بعد، وہ چھوٹا سا اندھیرا کمرہ میرے لیے ایک خاموش وار روم بن گیا۔ شاہ میر نے کھڑکیوں کے پردے مزید گرا دیے تاکہ باہر سے کوئی اندر نہ جھانک سکے۔ میں اپنی میز پر بیٹھ گیا اور اپنا لیپ ٹاپ کھول لیا۔ میرے سامنے وہ فائلیں اور ڈائریاں کھلی تھیں جن میں مظلوموں کی داستانیں رقم تھیں۔ سردار زارق خان جیسے جابروں نے اس مٹی پر جو زخم دیے تھے، وہ اب میرے الفاظ بننے والے تھے۔ میں نے ان لاپتہ نوجوانوں کے بوڑھے باپوں کی آنکھیں یاد کیں، ان ماؤں کے آنسو یاد کیے جو کوئٹہ کیمپوں میں بیٹھی اپنے پیاروں کی راہ تک رہی تھیں۔ میرا دل ایک عجیب سے دکھ اور غصے سے بھر گیا۔ میرا قلم کاغذ پر چلنے لگا۔ میں نے ریاست کے پروٹوکولز، سیکیورٹی کے اداروں اور ان کے درمیان پستی ہوئی معصوم عوام کے بنیادی حقوق پر ایک انتہائی جاندار اور کاٹ دار مقالہ لکھنا شروع کر دیا۔وقت کا پتا ہی نہیں چلا، الفاظ میرے جذبات کے ساتھ بہتے رہے اور سارا دن اسی ذہنی اور قلمی جہاد میں گزر گیا۔شام ڈھلی، مغرب کی اذان ہوئی اور پھر اندھیرا گہرا ہو گیا

لیکن میری نظریں اب بھی سچائی کو کاغذ پر اتارنے میں مصروف تھیں کہ اسی دوران سیف ہاؤس کے باہر گاڑی کے بریکوں کی ہلکی سی آواز ابھری۔ کچھ ہی لمحوں بعد دروازے کا لاک کھلا اور میجر سعید اندر داخل ہوئے ان کی آنکھوں میں ایک گہرا، جلال بھرا اطمینان ابھر رہا تھا۔ انہوں نے اپنا بریف کیس میز پر رکھا اور اپنی کیپ اتار کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ہم نے روایتی انداز میں ان کا استقبال کیا اور دن بھر کی خیر خیریت پوچھی۔ اس مختصر اور رسمی بات چیت کے فوراً بعد، میں اور شاہ میر اب مزید اپنی بے تابی پر قابو نہ رکھ سکے۔ ہم نے ان کے قریب ہوتے ہوئے پوچھا، ہاں میجر صاحب کینٹ کی کیا صورتحال ہے؟ وہاں کیا بنا؟ میجر سعید نے ہم دونوں کے چہروں پر پھیلی بے چینی کو دیکھا، ان کے لبوں پر ایک پُرعزم مسکراہٹ ابھری اور انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا، دوستو، خوشخبری ہے۔ہمارا پہلا تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ کام باقاعدہ شروع ہو چکا ہے اور ہائی کمان پوری طرح الرٹ ہے۔انہوں نے کینٹ کے اس بند کمرے کا پورا منظر میری آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کیا

وہ گہرا سانس لے کر کہنے لگے ذیشان میں صبح ٹھیک نو بجے جب وہ مہر بند فائل اپنے سینے سے لگائے کینٹ کے ہیڈ کوارٹرز پہنچا، تو وہاں کی فضا میں ایک عجیب سا سکون تھا، لیکن جیسے ہی میں بریگیڈیئر صاحب کے آفس کے بھاری لکڑی کے دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہوا، تو وہاں کا ماحول بالکل بدل گیا۔ کمرے میں ایک سخت، اعصاب شکن تناؤ موجود تھا۔ بریگیڈیئر صاحب نے میری طرف دیکھا، ان کی عقابی نظروں میں ایک سوال تھا، میں نے خاموشی سے وہ مہر بند فائل ان کے سامنے میز پر رکھ دی۔ انہوں نے فوراً اپنے آپریٹر کو حکم دیا کہ دروازے بند کر دیے جائیں اور

کسی بھی جونیئر یا سینیئر افسر کو بنا اجازت اندر آنے کی جرات نہ ہو۔ اس کے بعد اس بند کمرے میں ایک انتہائی خفیہ، ان کیمرہ بریفنگ کا آغاز ہوا۔ میجر سعید کی آنکھوں میں اس لمحے کا جلال صاف دیکھا جا سکتا تھا، وہ آگے بولے، "میں نے جیسے ہی زارق خان کے نیٹ ورک کی ایک ایک پرت ان کے سامنے کھولی، اس کی نجی جیلوں کے نقشے دکھائے اور پڑوسی ملک سے آنے والے جدید ترین اسلحے کے ناقابلِ تردید ثبوت ان کی میز پر بکھیرے، تو بریگیڈیئر صاحب کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔ وہ اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے اور دنگ رہ گئے کہ کینٹ کی ناک کے نیچے، اس مٹی پر غداری کا اتنا بڑا قلعہ بن چکا تھا اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔

انہوں نے اسی وقت پورے کینٹ میں نیڈ ٹو نو (Need to Know) کا لوہے کا اصول لاگو کر دیا تاکہ کوئی جونیئر افسر یا اہلکار بھی اس مشن کی بھنک نہ پا سکے۔ ذیشان تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس بند کمرے کے اندر وقت کیسے پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ صبح نو بجے سے شروع ہونے والی وہ ان کیمرہ بریفنگ اور بحث دوپہر کے ٹھیک دو بجے تک مسلسل چلتی رہی۔ بریگیڈیئر صاحب نے سردار زارق خان کے اثر و رسوخ، اس کے سیاسی مہروں اور اس کے خوفناک نیٹ ورک کی سنگینی کو پوری طرح بھانپ لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر اس کیس کو روایتی ملٹری یا سول پروٹوکول کے تحت چلایا گیا، تو فائلوں کے تبادلے، دفتری تاخیر اور کاغذی کارروائیوں کی نذر ہو کر یہ مشن پہلے ہی دن لیک ہو جائے گا اور زارق خان خود کو بچانے میں کامیاب ہو جائے گا میجر سعید صوفے پر تھوڑا آگے کو جھکے اور اپنی آواز کو مزید دھیما اور گہرا کرتے ہوئے بولے کئی گھنٹوں کے شدید غور و فکر، نقشوں کے جائزے اور قانونی پیچیدگیوں پر بحث کے بعد بریگیڈیئر صاحب نے ایک انتہائی بڑا اور غیر معمولی قدم اٹھایا انہوں نے اسی وقت اپنے خصوصی اور ہنگامی اختیارات (Emergency Powers) کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے کسی بھی بیرونی دباؤ یا دفتری رکاوٹ کو بائی پاس کرتے ہوئے کینٹ کے تین سینیئر ترین، انتہائی نڈر اور قابلِ بھروسہ انٹیلیجنس افسران کو فوری طور پر اپنے آفس طلب کیا۔ ان تینوں افسران کے سامنے جب یہ کیس رکھا گیا تو وہ بھی ہکا بکا رہ گئے۔

بریگیڈیئر صاحب نے ان تینوں کو ملا کر ایک مخصوص اور انتہائی خفیہ کور ٹیم (Core Team) تشکیل دے دی اور انہیں براہِ راست یہ ٹاسک سونپ دیا کہ اب اس پورے آپریشن کی کمانڈ ان کے ہاتھ میں ہے۔ ان کو واضع احکامات دیے گئے کہ کوئی فائل ورک نہیں ہوگا، کوئی روایتی تاخیر برداشت نہیں کی جائے گی، بلکہ جنگی بنیادوں پر اس حساس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔ میں سانس روکے میجر سعید کی ایک ایک بات سن رہا تھا، جیسے میں خود اس کمرے میں موجود ہوں۔ میجر سعید نے میری طرف دیکھا اور پُر عزم لہجے میں کہا، پھر شام کے چھ بجے، جب کینٹ کے اوپر اندھیرا چھانے لگا، تو بریگیڈیئر صاحب نے اس پورے خفیہ مشن کو ایک باقاعدہ اور انتہائی خفیہ کوڈ نیم

دیا 'آپریشن خضدار کریک ڈاؤن'۔ یہ نام سنتے ہی کمرے میں موجود کور ٹیم کے چہروں پر ایک جلال ابھر آیا، کیونکہ یہ صرف ایک چھاپہ نہیں بلکہ زارق خان کے کالے دھندوں کو ہمیشہ کے لیے توڑنے کا آغاز تھا۔ اسکے بعد قانونی پروٹوکول کو پورا کرنے کیلئے تاکہ عدالت میں ہمارا کیس کمزور نہ پڑے۔ اس کے لیے خضدار کے مقامی فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کو کینٹ ہیڈ کوارٹرز بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن یہ سب اتنا خفیہ تھا کہ مجسٹریٹ کو لانے کے لیے کوئی سرکاری گاڑی نہیں بھیجی گئی، بلکہ ایک عام، سول گاڑی میں سویلین کپڑوں میں ملٹری انٹیلیجنس کے بندے گئے اور انہیں انتہائی رازداری سے کینٹ کے اندر لے آئے۔

میجر سعید مزید بات جاری رکھتے ہوئے بولے مجسٹریٹ صاحب جب بریگیڈیئر کے آفس میں داخل ہوئے تو وہاں کی سیکیورٹی اور تناؤ دیکھ کر ہی وہ سمجھ گئے کہ معاملہ معمولی نہیں ہے۔ ان کے سامنے وہ مہر بند فائل رکھی گئی اور بریگیڈیئر صاحب نے ایک انتہائی سنجیدہ لہجے میں انہیں ملکی سلامتی کے خطرات سے آگاہ کیا۔ مجسٹریٹ صاحب نے بنا کوئی سوال کیے، سرچ وارنٹ اور ہنگامی چھاپے کے سرکاری کاغذات پر اپنے دستخط ثبت کر دیے اور مہر لگا دی۔ لیکن رازداری کا یہ عالم تھا، کہ اس مجسٹریٹ کو بھی دستخط کرتے وقت یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ چھاپہ خضدار کے کس مخصوص علاقے، کس کے مرغیوں کے فارم ہاؤس یا کس بڑے سردار پر مارا جانے والا ہے۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ کینٹ کی فورسز خضدار کی حدود میں کسی بہت بڑے آپریشن کے لیے نکلنے والی ہیں، لیکن ہدف کا نام اور پتہ آخری سیکنڈ تک صرف بریگیڈیئر صاحب اور میری اس کور ٹیم کے سینوں میں ہی دفن رہے گا تاکہ کسی بھی قسم کے لیک کا کوئی چانس ہی نہ بچے۔

میجر سعید کی یہ بات سن کر میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ایک صحافی ہونے کے ناطے قانون اور پروٹوکولز پر میری نظر تھی، میں نے الٹے ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی ٹھوڑی کو کھجلایا، میجر سعید کی آنکھوں میں دیکھا اور حیرت سے پوچھا: ''لیکن میجر صاحب! ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ خود قانون کا محافظ ہوتا ہے۔ کینٹ کا دباؤ اپنی جگہ، لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے ہدف کا نام، پتہ اور علاقے کی تفصیل جانے بغیر ہی اتنے بڑے سرچ وارنٹ پر چپ چاپ سائن کر دیے؟ کیا اس نے قانون کا حوالہ دے کر ضد نہیں کی کہ سائن کرنے سے پہلے مجھے پتا تو چلے کہ ہم کس کے گھر یا ڈیرے پر ہاتھ ڈالنے جا رہے ہیں؟
میرے اس سوال پر پاس بیٹھے شاہ میر نے بھی اثبات میں سر ہلایا، جیسے وہ بھی اسی الجھن کا شکار تھا۔ کمرے میں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی اور ہم دونوں میجر سعید کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے کہ ملٹری انٹیلیجنس نے اس قانونی رکاوٹ کو کیسے عبور کیا۔

میجر سعید کے لبوں پر ایک پُرعزم اور گہری مسکراہٹ ابھر آئی، جیسے وہ پہلے ہی سے جانتے تھے کہ میرا صحافیانہ دماغ اس قانونی باریکی کو ضرور پکڑے گا۔

وہ دھیمے مگر پُرعزم لہجے میں بولے ذیشان، تمہارا یہ سوال بالکل بجا ہے اور قانون بھی یہی کہتا ہے، لیکن ملٹری انٹیلیجنس نے یہاں قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی ایک خاص پروٹوکول استعمال کیا۔ بریگیڈیئر صاحب نے مجسٹریٹ کے سامنے زارق خان کے خلاف تیار کی گئی وہ اصل مہر بند انٹیلیجنس رپورٹ اور تمام شواہد کی فائل رکھی۔ مجسٹریٹ نے اس فائل میں موجود ملک دشمن نیٹ ورک کی سنگینی، اسمگل شدہ اسلحے اور وہاں بنے قید خانہ کی تصاویر اور ریاست کے خلاف سازش کے ٹھوس ثبوت خود اپنی آنکھوں سے دیکھے، جس سے وہ قانونی طور پر سو فیصد مطمئن ہو گیا کہ چھاپہ مارنا ناگزیر ہے۔ لیکن آپریشن کی رازداری کو برقرار رکھنے کے لیے، اس اصل فائل کے آخر میں ہدف کا نام، فارم ہاؤس کا درست پتہ اور نقشہ ایک مخصوص مہر بند لفافے کے اندر بند کر کے فائل کے ساتھ نتھی کیا گیا تھا۔ میجر سعید نے بات کو مزید واضح کرتے ہوئے کہا، بریگیڈیئر صاحب نے مجسٹریٹ کو آفیشل ملٹری مینوئل دکھاتے ہوئے کہا، جناب یہ کیس قومی سلامتی کا ہے اور اس پر ہائی کمان کی طرف سے رازداری کا سخت ترین لاک نافذ ہے۔ قانون کے مطابق ہدف کے تمام ٹھوس شواہد آپ کے سامنے ہیں، لیکن سیکیورٹی پروٹوکول کے تحت آپ اس مہر بند لفافے کو ابھی کھول نہیں سکتے۔ آپ اس مہر بند لفافے کے جوائنٹس اور وارنٹ کے کاغذ پر اپنے دستخط اور سرکاری مہر ثبت کر دیں تاکہ یہ قانونی ہو جائے۔ یہ مہر بند لفافہ چھاپے کے وقت، موقع پر آپ کی ہی موجودگی میں کھولا جائے گا تاکہ اس سے پہلے کینٹ کی دیواروں سے باہر ایک لفظ بھی لیک نہ ہو سکے۔ اس طرح مجسٹریٹ کی قانونی تسلی بھی ہو گئی کہ کیس بالکل سچا اور اصل ہے، اور دوسری طرف ہماری رازداری پر بھی کوئی آنچ نہیں آئی۔

میں نے متجسس انداز میں میجر سعید کی آنکھوں میں جھانکا اور پوچھا اچھا جب اس مہر بند لفافے پر مجسٹریٹ نے دستخط اور مہر ثبت کر دی، اور وہ کینٹ سے رخصت ہو گیا۔۔ تو اس کے فوراً بعد وہاں اندر کمرے میں کیا ہوا؟ بریگیڈیئر صاحب اور آپ کی کور ٹیم کا اب اگلا قدم کیا ہے؟

میجر سعید نے جواب دیا

اب آگے کا کھیل بہت سیدھا ہے ذیشان اللہ کا نام لے کر میدان میں اترنے کا وقت آ گیا ہے کیونکہ ہائی کمان سے ہمیں آفیشل اجازت مل چکی ہے۔ اب پیچھے ہٹنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ بریگیڈیئر صاحب نے کور ٹیم کو واضح احکامات جاری کر دیے ہیں کل کا پورا دن اندرونی تیاری کا ہے، فورسز کو پوزیشنز دی جائیں گی اور کل رات ہی زارق خان کے قلعے پر آخری اور فیصلہ کن ایکشن ہو گا۔

میجر سعید کی زبان سے ہائی کمان کے اس حتمی فیصلے اور کل رات ہونے والے ایکشن کا سن کر میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں نے ایک لمبا سانس لیا، صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور ان کی طرف دیکھ کر دھیمے لہجے

میں کہا: اچھا! ٹھیک ہے میجر صاحب یعنی کل رات ہی وہ فیصلہ کن گھڑی ہے جس کا ہمیں بے صبری سے انتظار تھا۔ تو پھر اس کا مطلب ہے کہ کل کا پورا دن ہمیں بھی یہاں سیف ہاؤس میں الرٹ رہنا ہوگا اور خود کو ذہنی طور پر تیار رکھنا ہوگا۔

میری بات سن کر میجر سعید نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا، پھر ان کی نظریں میز پر کھلے میرے لیپ ٹاپ اور وہاں بکھرے کاغذات پر پڑیں اور کہا بالکل ذیشان ہمیں ہر لمحہ الرٹ رہنا ہوگا۔ لیکن یہ بتاؤ، تم سناؤ، تمہارا دن کیسا گزرا؟ تم جس ہیومن رائٹس اور لاپتہ افراد کی رپورٹ پر کام کر رہے تھے، اس کا کیا بنا؟

میں نے کہا اللہ کا شکر ہے، آج کا پورا دن اسی کام میں لگایا اور اپنا وہ تفصیلی مقالہ اور آرٹیکل مکمل کر لیا ہے۔ بلوچستان کی اس مٹی پر زارق خان جیسے جابروں نے مظلوم عوام پر جو ستم ڈھائے ہیں، میں نے ان مظلوموں کی ایک ایک چیخ کو ان الفاظ میں سمو دیا ہے۔ جیسے ہی کل رات کینٹ کی فورسز زمین پر اپنا پہلا وار کریں گی، میرا یہ آرٹیکل بھی ظالموں کے ایوانوں میں زلزلہ لے آئے گا۔ میری بات سن کر میجر سعید کی آنکھوں میں داد دینے والی چمک ابھری بولے زبردست ذیشان یہی تو میں چاہتا تھا۔ زمین پر ہماری بندوقیں کام کریں گی اور میڈیا پر تمہارا یہ قلم زارق خان کے مہروں کو بے نقاب کرے گا۔ میجر سعید نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی، جس کی سوئیاں رات کے گیارہ بجنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ انہوں نے صوفے سے کھڑے ہوتے ہوئے دھیمے مگر پُرعزم لہجے میں کہا چلو دوستو! اب باقی باتیں کل پر چھوڑتے ہیں اب ہمارے لیے تازہ دم ہونا اور ذہنی طور پر تیار رہنا سب سے زیادہ ضروری ہے، اس لیے اب ارام کرتے ہیں۔ میں نے اور شاہ میر نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔ شاہ میر نے آگے بڑھ کر میز پر بکھرے ہوئے کاغزات سمیٹے اور انہیں ایک محفوظ جگہ پر رکھ دیا، جبکہ میں نے کمرے کے بلب کا سوئچ آف کر دیا۔ پورا سیف ہاؤس اب اندھیرے اور ایک پُراسرار خاموشی کی چادر میں لپٹ چکا تھا، صرف کھڑکی کے پردوں کے پار سے خضدار کی ٹھنڈی رات کی سائیں سائیں کرتی ہوا کی آواز آ رہی تھی۔ ہم اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے، لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اندھیرے میں چھت کو تکتے ہوئے میرے دماغ میں زارق خان کے ظلم کی داستانیں اور کل رات ہونے والے آپریشن خضدار کریک ڈاؤن کے مناظر کسی فلم کی طرح چل رہے تھے۔ دل کی دھڑکنیں تیز تھیں، مگر اللہ پر کامل یقین تھا کہ کل صبح سچ کا سورج ضرور طلوع ہوگا۔ اسی کشمکش اور سوچوں کے تانے بانے بنتے، نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور ہم گہری نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

اگلی صبح ناشتہ کرنے کے بعد ٹھیک آٹھ بجے ہم میجر سعید کی اپنی ذاتی گاڑی میں بیٹھے اور سیف ہاؤس سے باہر نکل گئے خضدار کی سڑکوں پر صبح کی چہل پہل ابھی شروع ہی ہو رہی تھی کہ ہماری گاڑی سیکیورٹی کے سخت مراحل سے گزرتی ہوئی تھوڑی ہی دیر میں خضدار کینٹ کے فولادی دروازوں کے پار داخل ہوگئی۔ کینٹ کا ماحول باہر کی دنیا سے

بالکل مختلف اور انتہائی پر سکون تھا، لیکن اس سکون کے پیچھے ایک گہرا طوفان چھپا تھا۔
گاڑی کینٹ کے ایک پر سکون حصے میں بنے میجر سعید کے سرکاری کوارٹر کے سامنے رکی۔ ہم تینوں کواٹر کے اندر داخل ہوئے۔ میجر سعید نے ہم سے کہا تم دونوں یہاں آرام کرو اور بالکل الرٹ رہو میں وردی تبدیل کر کے ہیڈکوارٹر رپورٹ کر رہا ہوں۔ چند ہی منٹوں میں میجر صاحب خاکی دستانے، چمکتے ہوئے بوٹ اور اپنی وردی میں ملبوس ہو کر کمرے سے نکلے۔ ان کے چہرے پر موجود سنجیدگی یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ اب انٹیلیجنس کا کھیل ختم اور فیلڈ کا ایکشن شروع ہونے والا ہے۔ وہ اپنی مخصوص سرکاری جیپ میں بیٹھ کر ڈیوٹی کے لیے روانہ ہو گئے، جبکہ میں اور شاہ میر اسی سرکاری کوارٹر کے بند کمرے میں بیٹھ کر دل کی تیز دھڑکنوں کے ساتھ انتظار کرنے لگے۔
کونے میں لگی دیوار گیر گھڑی نے جیسے ہی دوپہر کے گیارہ بجائے، کینٹ کے اندرونی سیکیورٹی زون میں ہلچل تیز ہو گئی۔ اس وقت کینٹ کے ایک بند بیرک کے اندر فرنٹیئر کونسٹیبلری (FC) کے چیدہ چیدہ جوانوں اور ان کے ساتھ بیک اپ کے لیے موجود آرمی کے ایلیٹ کمانڈوز کی دو بھاری ٹکڑیوں کو ہنگامی طور پر ہائی الرٹ رہنے کا حکم ملا۔
کمانڈوز کو کینٹ کی مرکزی آرمری سے ملٹری گریڈ بلٹ پروف جیکٹس اور جدید ترین نائٹ ویژن آلات جاری کیے گئے، جبکہ ایف سی کے جوانوں کو ان کے روایتی ہتھکنڈوں کے مطابق اضافی گولہ بارود اور خودکار ہتھیار سنبھالنے کی ہدایت دی گئی۔ ان سب کو بیرک کے اندر ہی سٹینڈ بائی پوزیشن پر رہنے کا حکم دیا گیا تاکہ رات کے مشن کے لیے وہ ذہنی اور جسمانی طور پر تیار رہیں۔ ابھی تک کسی بھی جونیئر افسر یا جوان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کا اصل ہدف کیا ہے یا انہیں کس علاقے میں جانا ہے۔ مشن کی رازداری کو برقرار رکھنے کے لیے ہر چیز کو انتہائی خفیہ رکھا جا رہا تھا۔
شام کے تین بجے، آپریشن خضدار کریک ڈاؤن کی رازداری کو برقرار رکھنے کے لیے سیکیورٹی فورسز نے ایک بڑا اور سخت قدم اٹھایا۔ سیکٹر کمانڈر کے خصوصی احکامات پر، اس مشن کے لیے تیار کیے گئے تمام جوانوں، نائیک، لانس نائیک اور جونیئر افسران کو ایک لائن میں کھڑا کیا گیا اور ان کے تمام موبائل فونز، سمارٹ واچز اور یہاں تک کہ وائرلیس کمیونیکیشن کے نجی آلات بھی کینٹ کے سیکیورٹی سیل میں جمع کر لیے گئے۔اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ خضدار شہر یا کینٹ کے اندر سے زارق خان کے کسی بھی مخبر تک یہ خبر نہ پہنچ سکے کہ فورسز حرکت میں آ رہی ہیں۔
موبائل فونز جمع کرنے کے بعد تمام جوانوں اور افسران کو سختی سے ہدایت کی گئی کہ وہ روانگی کے فائنل حکم تک بیرکوں سے باہر قدم نہیں نکالیں گے۔ ان کا شام کا کھانا بھی وہیں بیرک کے اندر ہی پہنچا دیا گیا۔ کینٹ کا وہ مخصوص حصہ اب بیرونی دنیا سے بالکل کٹ چکا تھا اور وہاں ایک مکمل ڈیجیٹل بلیک آؤٹ نافذ ہو چکا تھا، تاکہ جوان تازہ دم بھی رہیں اور رازداری پر بھی کوئی آنچ نہ آئے۔وقت رینگتا رہا اور اندھیرا گہرا ہوتا گیا۔ میں اور شاہ میر میجر صاحب کے کوارٹر میں بیٹھے بے چینی سے گھڑی دیکھ رہے تھے۔ باہر خضدار کی رات اپنے عروج پر تھی اور کینٹ کے اندر کی خاموشی اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔ رات کے تقریباً دس بجے، کوارٹر کی لاؤنج میز پر رکھے انکرپٹڈ (خفیہ) سیٹلائٹ

فون کی تیز گھنٹی نے کمرے کے سناٹے کو چیر دیا۔ میجر سعید کا فون تھا۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے میجر سعید کی دھیمی مگر انتہائی سنجیدہ اور نپی تلی آواز ابھری، جس نے میرے پورے وجود میں سنسنی دوڑا دی۔۔۔
ہیلو، ذیشان؟

جی میجر صاحب، میں ذیشان بول رہا ہوں میں نے فوراً جواب دیا۔ رسمی سلام دعا اور ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنے کے بعد، میجر سعید کے لہجے میں اچانک ایک گہری سنجیدگی اور غیر معمولی تناؤ ابھر آیا۔ انہوں نے دھیمے مگر انتہائی نپے تلے الفاظ میں کہا،ذیشان میری بات بہت غور سے سنو۔ تم جس ہیومن رائٹس اور زارق خان کی فنانشل رپورٹ پر کام کر رہے تھے، اسے آج پبلش بالکل نہیں کرنا اسے فی الحال روک دو۔ میجر سعید کی بات سن کر میں بری طرح چونک اٹھا اور ریسیور پر میری گرفت مضبوط ہو گئی، لیکن کیوں میجر صاحب؟ ہر چیز تو فائنل ہو چکی تھی، اب اچانک روکنے کی وجہ؟ کیا ہماری تفتیش میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟ نہیں ذیشان بات وہ نہیں ہے میجر سعید نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ایک بہت ہی سنگین اور گمبھیر مسئلہ بن گیا ہے، جس کی حساسیت کی وجہ سے میں تمہیں فی الحال فون پر کچھ نہیں بتا سکتا۔

جب آج رات کا ہمارا یہ پورا آپریشن مکمل ہو جائے گا اور ہم واپس ملیں گے، تو میں تمہیں تفصیل سے ایک ایک وجہ بتا دوں گا کہ میں نے تمہیں کیوں روکا تھا۔ لیکن اس وقت سیکیورٹی اور رازداری کا تقاضا یہی ہے کہ تمہارا قلم بالکل خاموش رہے
میں نے خاموشی سے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا، لیکن میجر سعید کے لہجے کی سنگینی اور ان کی انٹیلیجنس کی مہارت کو دیکھتے ہوئے میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ بیک گراؤنڈ میں ضرور کوئی بہت بڑا اور گہرا مسئلہ کھڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ ہنگامی حکم جاری کیا گیا ہے۔ میں نے مڑ کر شاہ میر کی طرف دیکھا، جو میرے چہرے کے اڑتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر شدید تشویش میں مبتلا نظر آ رہا تھا۔اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا، ذیشان خیریت تو ہے؟ میجر سعید نے فون پر ایسا کیا کہہ دیا کہ تمہارے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں؟ میں نے ایک طویل اور گہرا سانس لیا اور کہا شاہ میر، میجر صاحب نے ابھی ہمیں وہ آرٹیکل اور انویسٹی گیشن رپورٹ پبلش کرنے سے سختی سے منع کر دیا ہے۔ انہوں نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ اسے فی الحال روک دو۔ شاہ میر نے پوچھا
لیکن کیوں؟ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا،
میجر صاحب نے وجہ صاف نہیں بتائی، انکا کا کہنا ہے کہ کوئی بہت ہی سنگین اور گمبھیر مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے جسے وہ

سیکیورٹی وجوہات کی بنا پر ابھی فون پر شیئر نہیں کر سکتے زارق خان کے نیٹ ورک کے حوالے سے کوئی ایسی حساس بات سامنے آئی ہے جس کا انکشاف وہ آپریشن مکمل ہونے کے بعد ہی کریں گے انہوں نے بس ہمیں خاموش رہنے اور انتظار کرنے کا حکم دیا ہے۔شاہ میر نے نفی میں سر ہلایا، لیکن اس کے چہرے پر تفہیم کے تاثرات ابھر آئے۔ خیر، اب ہم کر بھی کیا سکتے ہیں، اس نے دھیمی آواز میں کہا، میجر سعید انٹیلیجنس کے بندے ہیں، اگر انہوں نے روکا ہے تو یقیناً کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہوئی ہوگی۔ چلو پھر خاموشی سے انتظار کرتے ہیں۔ جب آج رات کا یہ آپریشن مکمل ہوگا اور وہ واپس آئیں گے، تبھی اصل حقیقت کا پتہ چلے گا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو،" میں نے اثبات میں سر ہلایا پھر اچانک مجھے ایک بات یاد آئی۔ میں نے لیپ ٹاپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، شاہ میر، ایک اور ضروری کام ہے۔ میں نے میڈیا میں اپنے جن دو تین انتہائی قابلِ اعتماد بیورو چیف دوستوں کو الرٹ کر رکھا تھا کہ کل صبح

کے اخبار میں فرنٹ پیج پر

میں نے ایک 'بڑی انویسٹی گیٹو اسٹوری کی خبر پبلش کروانی ہے مجھے انہیں بھی روکنا ہوگا۔

وہ میری اس خبر کے لیے اپنے اخبار اور مارننگ شو میں ایک خاص سلاٹ (جگہ) خالی چھوڑ کر میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اگر میں نے اب انہیں اشارہ نہ دیا، تو وہ رات گئے میرا مواد نہ ملنے پر پریشان ہو جائیں گے۔کوارٹر کی میز پر ایک آفیشل کمیونیکیشن فون موجود تھا، جس کے ذریعے محفوظ لائن پر رابطہ ممکن تھا۔ میں نے اس فون کا ریسیور اٹھایا اور انتہائی احتیاط اور نپے تلے انداز میں باری باری ان اخبارات کے بیورو چیفس کو کال ملائی اور کہا یار وہ جو کل صبح کے فرنٹ پیج اور ہیڈ لائنز کے لیے میں نے ایک بڑی اسٹوری کا کہا تھا، کچھ ناگزیر تکنیکی اور قانونی وجوہات کی بنا پر اس فائل کو فی الحال روک دیا گیا ہے۔ اس لیے کل صبح کے اخبار میں میری وہ خبر نہیں چھپے گی اور نہ ہی ہیڈ لائنز میں کوئی نیوز آئے گی۔ آپ لوگ مہربانی کر کے فرنٹ پیج کی اس مخصوص جگہ پر کوئی اور عام خبر ایڈجسٹ کر لیں جیسے ہی یہ فائل کلیئر ہوگی، میں خود سب سے پہلے آپ کو مواد دوں گا۔دوسری طرف سے میرے دوستوں نے میری پیشہ ورانہ ساکھ اور سیکیورٹی کی حساسیت کو جانتے ہوئے بغیر کوئی اضافی سوال کیے تصدیق کر دی کہ وہ اس جگہ پر کوئی دوسری سیاسی یا علاقائی خبر چلا دیں گے۔ فون رکھ کر میں نے ایک بار پھر اپنے بند لیپ ٹاپ کو دیکھا۔ اب ہم دونوں بالکل نہتے اور بے بس تھے، مگر ہمارے دلوں میں ایک عجیب سا سسپنس مچل رہا تھا۔

دیوار گیر گھڑی کی سوئیوں نے جیسے ہی رات کے ٹھیک گیارہ بجائے، خضدار کینٹ کی خاموشی ایک دم ٹوٹی۔ سیکیورٹی زون کے آہنی دروازے آہستہ سے کھلے اور بلیک آؤٹ لائٹس کے ساتھ فرنٹیئر کونسٹیبلری (FC) اور آرمی کے ایلیٹ کمانڈوز کی بھاری گاڑیاں ایک ایک کر کے باہر نکلنا شروع ہوئیں۔

لیکن میجر سعید ان کے ساتھ گاڑی میں نہیں گئے وہ کینٹ کے حساس کمانڈ اینڈ کنٹرول روم میں چلے گئے جہاں بڑی

اسکرینوں پر میپس (Maps) اور وائرلیس سیٹ چل رہے تھے
گاڑیوں کے انجنوں کی دھیمی گرج رات کے سناٹے میں ایک عجیب سا خوف پیدا کر رہی تھی۔ کینٹ کی حدود سے نکلتے ہی یہ دستے خضدار کی ویران سڑکوں پر ایک مخصوص فارمیشن کے تحت آگے بڑھنے لگے۔راستے بھر مکمل خاموشی تھی اور گاڑیوں کے اندر بیٹھے کمانڈوز کے چہروں پر عزم اور سنجیدگی عیاں تھی ہر جوان اپنی خودکار رائفل پر گرفت مضبوط کیے، کسی بھی ناگہانی صورتحال کے لیے الرٹ تھاسردار زارق خان کا وہ پرانا ڈیرا (مرغیوں کا فارم ہاؤس) خضدار شہر کے مضافات میں واقع تھارات کے بارہ بج کر تیس منٹ پر یعنی ٹھیک ساڑھے بارہ بجے فورسز کی گاڑیاں ہدف سے کچھ فاصلے پر رکیں۔ کمانڈوز نے سائے کی طرح خاموشی سے پوزیشنز سنبھالیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ڈیرے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

پونے ایک بجے، جب پورے فارم ہاؤس پر رات کا سکون طاری تھا، کینٹ کے کنٹرول روم سے میجر سعید کا وائرلیس پر فائنل سگنل ملتے ہی فیلڈ کمانڈر نے ایکشن کا حکم دیا۔ چونکہ یہ ایک باقاعدہ قانونی چھاپہ تھا، اس لیے کسی قسم کی توڑ پھوڑ یا فائرنگ کے بجائے مجسٹریٹ کی موجودگی میں سیکیورٹی فورسز کے ایک افسر نے آگے بڑھ کر ڈیرے کا مرکزی دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر موجود چوکیدار نے جیسے ہی دروازہ کھولا، سامنے مجسٹریٹ اور فورسز کی بھاری نفری دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔فورسز انتہائی پرسکون مگر الرٹ انداز میں اندر داخل ہوئیں۔ مرغیوں کے اس فارم ہاؤس میں رات کی شفٹ کے دس پندرہ عام ورکرز بھی موجود تھے جو مرغیوں کی دیکھ بھال اور خوراک ڈالنے کے کام میں مصروف تھے۔ اچانک فورسز کو دیکھ کر وہ سب سہم گئے، لیکن فیلڈ کمانڈر نے فوراً انہیں تسلی دی کہ عام شہریوں اور ملازمین کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ قانونی ضابطے کے تحت تمام ورکرز کو ایک طرف پرامن طریقے سے بٹھا دیا گیا تاکہ تلاشی کے کام میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔ اسی دوران کمانڈوز کی ایک ٹکڑی نے فارم ہاؤس کے نجی کمرے کا گھیراؤ کر کے زارق خان کے خاص کارندوں کو بغیر کسی مزاحمت کے انتہائی خاموشی سے دبوچ لیا اور قانون کے مطابق ان کے ہاتھ پیچھے کر کے ہتھکڑیاں لگا دیں۔ مجسٹریٹ کی نگرانی میں ڈیرے کے کونے کونے کی باریک بینی سے تلاشی لی جا رہی تھی انٹیلیجنس رپورٹس اور نقشے کے مطابق فورسز کو پہلے ہی معلوم تھا کہ یہاں ایک تہہ خانہ موجود ہے، اس لیے فیلڈ کمانڈر کے حکم پر سردار زارق خان کے ایک کارندے سے اس کا لوہے کا بھاری دروازہ کھلوایا گیا۔

جب فورسز اندر داخل ہوئیں تو بظاہر وہاں زارق خان کا وہ قانونی اسلحہ ترتیب سے رکھا ہوا تھا جس کے لائسنس بنے ہوئے تھے، لیکن تلاشی کا عمل یہیں نہیں رکا۔ جوانوں نے جب انٹیلیجنس معلومات کے مطابق فرش اور دیواروں کا باریک بینی سے معائنہ شروع کیا، تو اسی قانونی اسلحے کے خانے کے نیچے فرش میں ایک اور خفیہ اور گہرا سراغ ملا۔ یہ

اصل میں تہہ خانے کے اندر بنا ہوا ایک اور ڈبل خفیہ خانہ تھا جس کا راستہ بڑی مہارت سے چھپایا گیا تھا۔ جب اس دوسرے خفیہ خانے کا لاک کھول کر فورسز اندر داخل ہوئیں، تو وہاں کا منظر دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ وہاں بھاری مقدار میں جدید ترین ممنوعہ بھارتی اسلحہ، بارود اور خفیہ مواصلاتی آلات کا پورا ذخیرہ موجود تھا۔اسی تہہ خانے کے آخری کونے میں لوہے کی سلاخوں سے بنی نجی جیل بھی موجود تھی، جہاں زارق خان اپنے مخالفین کو قید رکھتا تھا، مگر خوش قسمتی سے اس وقت وہ نجی جیل بالکل خالی تھی۔ برآمد ہونے والے بھارتی اسلحے، وہاں سے ملنے والے حساس دستاویزات اور تمام ڈیجیٹل آلات کو فوراً قانونی ضابطے کے تحت ضبط کر کے فورسز کے بڑے ٹرکوں میں لوڈ کیا گیا۔
سیکیورٹی اور قانونی رازداری کو برقرار رکھتے ہوئے سردار زارق خان کے خاص کارندوں کے چہروں پر کالی پٹیاں باندھی گئیں اور انہیں الگ الگ محفوظ گاڑیوں میں منتقل کیا گیا۔ رات کے تقریباً دو اڑھائی بجے تک پورا ڈیرہ مکمل طور پر کلیئر کر دیا گیا تھا۔ تمام گاڑیاں بغیر کسی سائرن کے، رات کے اندھیرے میں خاموشی سے واپس کینٹ کی طرف روانہ ہوئیں اور سیکیورٹی زون کے فولادی دروازوں کے پار داخل ہو گئیں۔ یہ پورا انٹیلیجنس آپریشن تقریباً تین گھنٹوں میں انتہائی خاموشی اور پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔
کینٹ پہنچتے ہی میجر سعید نے سب سے پہلے قیدیوں کو حراستی مرکز منتقل کروایا اور برآمد شدہ مال کو آفیشل ریکارڈ میں درج کرنے کا حکم دیا۔ یہ سب نپٹانے کے بعد، انہوں نے کنٹرول روم سے انکرپٹڈ لائن پر اپنے اعلیٰ افسر، بریگیڈیئر صاحب کو کال ملائی۔ میجر سعید نے انتہائی نپے تلے اور پیشہ ورانہ انداز میں بریفنگ دیتے ہوئے کہا، سر! آپریشن کامیابی سے مکمل ہو چکا ہے۔ ہدف کو حراست میں لے لیا گیا ہے اور بھاری مقدار میں بھارتی اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ ہماری ٹیم محفوظ طریقے سے واپس لوٹ آئی ہے۔ بریگیڈیئر صاحب کی طرف سے گرین سگنل ملنے اور تمام ضروری کاغذی کارروائی مکمل کرنے کے بعد، میجر سعید عارضی طور پر اپنی ڈیوٹی سے آف ہوئے۔ وہ تھکے ہوئے قدموں مگر ایک کامیاب مشن کے عزم کے ساتھ صبح کے چھ بجے اپنے سرکاری کوارٹر واپس پہنچے، جہاں، میں اور شاہ میر رات بھر جاگنے کی وجہ سے شدید بے چینی اور دل کی تیز دھڑکنوں کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔
انہوں نے آگے بڑھ کر ہم سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اس ہنگامی رات میں ایک دوسرے کی خیریت جاننے کے لیے ہمارے درمیان مختصر رسمی سلام دعا ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی خاکی ٹوپی میز پر رکھی اور ایک گہرا سانس لے کر ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔میجر سعید نے ہماری طرف دیکھا اور بغیر کسی تمہید کے دھیمی مگر پرعزم آواز میں کہا، "ذیشان، شاہ میر! آپریشن تو 100٪ کامیاب رہا۔ فورسز نے اس پورے ڈیرے کو کامیابی سے کلیئر کر دیا ہے اور وہاں سے بھاری مقدار میں جدید ترین ممنوعہ بھارتی اسلحہ اور خفیہ دستاویزات برآمد ہو چکی ہیں لیکن دوسری طرف، ہماری فنانشل کمپیوٹر ٹیم نے جو خفیہ طریقے سے کارروائی شروع کر رکھی تھی، اس کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ سردار زارق خان نے انتہائی چالاکی سے متعدد جعلی بینک اکاؤنٹس بنا رکھے تھے جن کی وجہ سے میں نے تمہیں رات

فون کر کے وہ انویسٹی گیٹو رپورٹ پبلش کرنے سے روکا تھا۔ جعلی اکاؤنٹس؟ میں نے بری طرح چونکتے ہوئے پوچھا۔ میجر صاحب، کیا مطلب جعلی اکاؤنٹس؟
میجر سعید نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور معاملے کی گمبھیرتا کو واضح کرتے ہوئے تفصیل سے بتانے لگے، ہاں ذیشان، سردار زارق خان کی چالاکی بڑی ہی گہری ہے۔ جب ہم نے کامران بلوچ سے تفتیش کی تھی، تو اس نے ہمیں یہی بتایا تھا کہ سارا فنڈ اور ریکارڈ سردار زارق خان کے نام پر ہے، اور بظاہر دیکھنے پر ہمیں بھی یہی لگا کہ یہ سارے اکاؤنٹس زارق خان کے ہی ہیں۔ لیکن اصل کھیل اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ تھا۔ زارق خان نے ایک خاص انکرپٹڈ فنانشل ایپ (Encrypted App) کے ذریعے ان اکاؤنٹس کو آپریٹ کر رکھا تھا، جس کا ڈیٹا عام طریقے سے ٹریس کرنا ناممکن تھا۔ جب کل رات ہماری سائبر کرائم اور فنانشل انٹیلیجنس کی ٹیم نے اس ایپ کے سیکیورٹی والز اور فائر والز کو توڑا اور اس کے فنانشل ڈیٹا کو گہرائی سے کھنگالا، تو اصل سچائی سامنے آئی جس نے ہمیں بھی دنگ کر دیا۔ سردار زارق خان کا نام تو بظاہر صرف دنیا کو دکھانے اور قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ایک فرنٹ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا تاکہ اگر کبھی کوئی بڑا قانونی ہاتھ پڑے، تو وہ خود کو بچا سکے۔ حقیقت میں، اس انکرپٹڈ سسٹم کے پیچھے چار بالکل الگ اور جعلی ناموں پر بنے ہوئے اکاؤنٹس تھے، جن کے ذریعے ایک خاص نیٹ ورک کے تحت سارا پیسہ گھمایا جا رہا تھا۔ یہ اس کی وہ شاطرانہ پلاننگ تھی کہ اگر کبھی وہ پھنس بھی جائے، تو اصل گرفت ان چار مہروں ان چار اسکے ملازموں پر آئے اور وہ خود قانون کے سامنے بالکل معصوم بن کر نکل جائے۔
ہماری ٹیم نے راتوں رات مستعدی دکھاتے ہوئے ان چاروں میں سے دو مہروں پر ہاتھ ڈال دیا ہے اور وہ اس وقت سیکیورٹی فورسز کی حراست میں آ چکے ہیں۔ لیکن ذیشان اصل مسئلہ اب بھی کھڑا ہوا ہے۔ ان دو بندوں کے پکڑے جانے کے باوجود ہم سردار زارق خان پر براہِ راست ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔

اگر ہم اس وقت اس پر ہاتھ ڈالیں، تو وہ سیدھا کہہ دے گا کہ ان اکاؤنٹس سے میرا کوئی لینا دینا نہیں ہے، یہ میرے نام پر ہیں ہی نہیں اور کسی نے میرے خلاف سازش کر کے میرے نام کا غلط استعمال کیا ہے دستاویزی طور پر اس کا نام کہیں نہ ہونے کی وجہ سے قانون کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ان دو بندوں کی گرفتاری کے باوجود اصل مجرم تک پہنچنے کا راستہ ابھی تک مسدود ہے۔ لیکن ذیشان، دستاویزی طور پر اس کا براہِ راست نام نہ ہونے کے باوجود ہم نے سردار زارق خان کی فنانشل کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ ہماری خفیہ ٹیم نے راتوں رات اسٹیٹ بینک آف پاکستان (SBP) کے اعلیٰ حکام سے ہنگامی رابطہ قائم کیا ہم نے ان چاروں ملازموں کے ناموں پر چلنے والے اکاؤنٹس کا پورا کچا چٹھا ان کے سامنے رکھا، جس پر اسٹیٹ بینک نے فوری ایکشن لیتے ہوئے ان تمام اکاؤنٹس کو منجمد کر دیا ہے ان اکاؤنٹس کے اندر اس نیٹ ورک کا جتنا بھی کالا دھن، مشکوک فنڈز اور کروڑوں روپے کی رقم موجود

تھی وہ سب اب بلاک ہو چکی ہے سردار زارق خان قانون کی گرفت سے شاید عارضی طور پر بچ نکلا ہو، لیکن فنانشل طور پر وہ اس وقت مکمل طور پر مفلوج ہو چکا ہے اس کا پورا سپلائی نیٹ ورک اب ایک روپے کی ٹرانزیکشن بھی نہیں کر سکتا یہ اس کے لیے ایک ایسا بڑا دھچکا ہے جس سے باہر نکلنا اب اس کے بس کی بات نہیں۔

میں نے کہا میجر صاحب، چلو مان لیا کہ وہ اپنے انکرپٹڈ اکاؤنٹس اور مہروں کے پیچھے چھپ کر فنانشل کیس سے بچ نکلنے کی کوشش کرے گا، لیکن وہ اس مادی ثبوت سے کیسے بچ سکتا ہے؟ اس کے مرغی خانے (فارم ہاؤس) سے جو اتنا بھاری ممنوعہ بھارتی اسلحہ، بارود اور خفیہ مواصلاتی آلات برآمد ہوئے ہیں، وہ تو ہمارے پاس موجود ہیں نا؟

میجر سعید نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے چہرے کی تھکن کو مسکراہٹ میں بدلتے ہوئے کہا، ذیشان، یہی تو سب سے بڑا مسئلہ اور اس کھیل کی اصل عیاری ہے وہ ڈیرہ اور مرغی فارم ہاؤس بھی کاغذی طور پر سردار زارق خان کے نام پر رجسٹرڈ ہی نہیں ہے۔ وہ پوری پراپرٹی اس کے ایک قریبی کارندے مراد خان نامی بندے کے نام پر ہے۔

اس لیے ذیشان، میں نے رات کو تمہیں کال کر کے وہ انویسٹی گیشن فائل پبلش کرنے سے روک دیا تھا،

میجر سعید کی یہ بات سنتے ہی میرے ذہن میں جیسے ایک دھماکہ ہوا اور پچھلی انویسٹی گیشن کی تمام کڑیاں میرے دماغ میں گھوم گئیں۔ میں نے صوفے سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کیا، میرا صحافتی اور قانونی تجربہ اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور میجر سعید کی طرف مڑ کر سنجیدگی سے کہا: میجر صاحب! شکر ہے میں نے اپ کے کہنے پر رات اپنے بیورو چیف دوستوں کو اشارہ کر کے وہ فائل پبلش ہونے سے روک دی تھی۔ اگر وہ رپورٹ پبلش ہو جاتی تو یہ تو اور بھی بڑا سنگین مسئلہ بن جاتا۔ زارق خان نے یہ سارا تانا بانا اتنی شاطرانہ عیاری سے بنا ہے کہ یہ کوئی عام کیس نہیں بلکہ ایک 'کاؤنٹر ٹریپ' تھا۔ میں نے تو یہ سب اپنی طرف سے مکمل خفیہ طریقے سے پبلش کرنا تھا تاکہ زارق خان کو کبھی پتہ ہی نہ چل سکے کہ یہ خبر میڈیا پر کس نے لیک کی ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ لیکن اس حالت میں پبلش کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔

ہمارا اصل مقصد تو اس مگرمچھ کو ٹھکانے لگانا تھا، لیکن اس ادھورے اور فرضی ڈیٹا کے ساتھ یہ فائل پبلش کرنا الٹا ہمارے لیے گلے کا طوق بن جاتا۔ سردار زارق خان اپنے بھاری اور شاطر وکیلوں کی فوج کھڑی کر کے عدالت میں یہ ثابت کر دیتا کہ یہ سارا ڈیٹا جعلی ہے، اور وہ میڈیا پر مظلوم بن کر بیٹھ جاتا کہ دیکھو، کچھ نادیدہ قوتیں میری عزت کے ساتھ کھیل رہی ہیں اور مجھ پر جھوٹے الزام لگا رہی ہیں۔ وہ قانون اور عوام کی نظروں میں ہمیشہ کے لیے مظلوم بن کر صاف بچ نکلتا اور میری سچی انویسٹی گیشن رپوٹ مشکوک ہو جاتی۔ میری بات سن کر شاہ میر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، لیکن ذیشان بھائی ایک اور بات بھی تو ہے نا۔ چلو مان لیا کہ وہ ڈیرہ اس کے نام پر نہیں ہے اور بینک اکاؤنٹس بھی جعلی ہیں لیکن وہ جو ممنوعہ مال اور اسلحہ سپلائی کرنے کے لیے گاڑیاں آتی ہیں، وہ تو اسی کی ہیں نا؟ ان گاڑیوں کے نمبر،

ان کا ریکارڈ اور یہ حقیقت کہ وہ ساری گاڑیاں ساحلِ سمندر سے غلط طریقے سے ممنوعہ مال لوڈ کر کے سیدھی اسی کے فارم ہاؤس پر آ کر رکتی تھیں، یہ تو ہمارے پاس پکا ثبوت ہے۔

یہ ثبوت تو ہم عدالت میں پیش کر کے اسے گھسیٹ سکتے ہیں نا؟ میں نے شاہ میر کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا، نہیں شاہ میر، قانون کی دنیا میں بات اتنی سیدھی نہیں ہوتی۔ اگر ہم گاڑیوں کا یہ ثبوت سامنے لائیں گے، تو زارق خان ایک سیکنڈ میں صاف مکر جائے گا اور پلہ جھاڑتے ہوئے کہے گا کہ ہماری گاڑیاں تو سخت سیکیورٹی چیکنگ کے بعد گزرتی ہیں اور گاڑیوں میں ہمارا صرف قانونی مال ہی لدا ہوتا ہے۔ مجھے کیا پتہ کہ میری پیٹھ پیچھے کیا ہو رہا ہے؟ اگر نیچے کوئی کارندہ یا ملازم میری ناک کے نیچے سیکیورٹی والوں سے آنکھ بچا کر گاڑی کے اندر کوئی غیر قانونی چیز چھپا کر سمگل کرتا ہے، تو آپ اس ملازم کو پکڑو، میرا اس سے کیا لینا دینا ہے؟ میں تو اپنے دوسرے کاروباری کاموں میں مصروف ہوتا ہوں۔ شاہ میر، تم نہیں جانتے کہ یہ بڑے مگرمچھ جب پھنستے ہیں، تو قانون کی ایسی ہی باریکیاں نکال کر بات کو اتنا لمبا اور پیچیدہ کر دیتے ہیں کہ اصل کیس دب کے رہ جاتا ہے۔ وہ سارا ملبہ اپنے جونیئر ملازموں پر ڈال کر خود صاف بچ نکلتے ہے۔میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا، اگر ہم دستاویزی ثبوتوں کی ایک ایک کڑی ملائیں اور اسے پیچھے دھکیلتے جائیں، تو ہم اس کے اصل لنک تک بالکل پہنچ سکتے ہیں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قانون کے ذریعے یہ کیس بہت لمبا کھنچ جائے گا اور ہمارے پاس اتنا وقت نہیں۔

ہمارا اصل منصوبہ تو ایک خفیہ اور اچانک سرپرائز پلان تھا کہ راتوں رات یہ فائل میڈیا پر پبلش کر دیں گے، جس سے ہر طرف اس کا کچا چٹھا کھل جائے گا اور میڈیا پر اس کی ایسی ذلت ہو گی کہ وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا اور سلاخوں کے پیچھے ہو گا۔لیکن چلو خیر ہے! بھلے ہی ہمارا وہ اصل منصوبہ کامیاب نہیں ہوا اور وہ خود عارضی طور پر قانون اور میڈیا کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے، لیکن اگر ہم غور کریں تو جسطرح میجر صاحب نے کہا ہم نے اسے ایک ایسی کاری ضرب لگائی ہے جس سے اس کے پورے نیٹ ورک کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔اس کے وہ تمام جعلی اکاؤنٹس منجمد ہونے سے اس کا کروڑوں روپے کا کالا دھن اب مٹی بن چکا ہے دوسرا یہ کہ اس کے ڈیرے سے جو بھاری مقدار میں جدید ممنوعہ بھارتی اسلحہ اور بارود کا ذخیرہ ملا ہے، وہ اب سیکورٹی فورسز کے قبضے میں ہے تیسرا بڑا دھچکا یہ ہے کہ اس اسمگلنگ کے غیر قانونی دھندے کو سنبھالنے والے اس کے کئی قریبی اور اہم لوگ اب فورسز کی حراست میں جا چکے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ وہ افرادی طور پر کافی اکیلا ہو گیا ہے۔ اور چوتھی سب سے بڑی بات یہ کہ اس کا وہ محفوظ سمجھا جانے والا غیر قانونی اسلحے کا پورا سپلائی نیٹ ورک اب ہمیشہ کے لیے تباہ ہو چکا ہے۔

بھلے وہ خود آزاد گھوم رہا ہو، لیکن ہم نے اسے چاروں طرف سے ایسا جکڑا ہے کہ وہ فنانشل اور عملی طور پر بالکل مفلوج ہو چکا ہے، اور یہ ہمارے اس خفیہ مشن کا ایک بہت بڑا اور شاندار نتیجہ ہے۔

میجر سعید نے میری بات سن کر اثبات میں زور سے سر ہلایا اور میری تائید کرتے ہوئے کہا، بالکل ذیشان! تم نے بالکل صحیح پوائنٹ پکڑا ہے۔ اس مگرمچھ کے لیے فی الحال یہ چاروں بڑے نقصانات ہی کافی ہیں۔ ویسے بھی اب سردار زارق خان پر سیکیورٹی فورسز اور تمام ایجنسیوں کی نظر پڑ چکی ہے، اور اب وہ ہر وقت خوف کے سائے میں رہے گا اور کوئی بھی غیر قانونی قدم اٹھانے سے پہلے سو بار سوچے گا۔ اسے پوری زندگی یہ پتہ ہی نہیں چل سکے گا کہ اس کے اس انکرپٹڈ سسٹم اور خفیہ ڈیرے کو کس نے اور کس طرح چاٹ کیا (توڑا) تھا۔دوسری اہم بات اگر ہم میڈیا کے ذریعے اس کیس پر دباؤ بڑھانے کی کوشش کریں گے، تو اس کا ملکی سلامتی کو نقصان پہنچے گا۔ جیسے ہی میڈیا پر بھارتی اسلحے کی برآمدگی کی خبر چلے گی، ہمارا پڑوسی ملک (بھارت) بین الاقوامی سطح پر واویلا شروع کر دے گا۔ وہ الٹا پروپیگنڈا کرے گا کہ 'دیکھیں جی! پاکستانی ایجنسیاں خود اپنے مضافات میں اسلحہ رکھ کر ہمیں بدنام کرنے کے لیے جھوٹے الزامات لگا رہی ہیں۔ یہ ایک ایسا لمبا اور پیچیدہ عالمی کھیل بن جائے گا کہ الٹا ہماری اپنی گورنمنٹ اور اوپر سے سیکیورٹی اداروں پر شدید دباؤ آ جائے گا اور وہ ہم ہی سے سوال جواب شروع کر دیں گے۔ اس لیے اس حساس موڑ پر میڈیا کا سہارا لینا بے وقوفی ہوگی۔ عقلمندی اسی میں ہے کہ اس کھیل کو یہیں خاموشی سے دفن کر دیا جائے ہمارا جو اصل منصوبہ تھا، اگر اس کے مطابق سب کچھ ہو جاتا اور سردار زارق خان اپنے تمام نیٹ ورک اور ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ فرنٹ لائن پر ہمارے ہاتھ آ جاتا، تو ہم اس پورے کیس کو ڈنکے کی چوٹ پر میڈیا کے سامنے لے آتے۔ تب ہمیں ان بھارتیوں یا ان کے کسی پروپیگنڈے کا کوئی ڈر نہیں تھا کیونکہ ہمارے پاس اصل مجرم اور ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہوتے۔ لیکن اب صورتحال بالکل مختلف ہے جب اصل مہرہ ہی غائب ہے اور وہ خود کو بچانے میں کامیاب ہو گیا ہے، تو اس نازک موڑ پر میڈیا کا سہارا لینا الٹا ہمارے لیۓ نقصان کا باعث ہوگا۔میں نے اور شاہ میر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میجر سعید کی اس اسٹریٹیجک سوچ نے ہمیں خاموش کر دیا تھا، کیونکہ وہ صرف ایک علاقائی اسمگلر کو نہیں بلکہ پورے ملک کی سلامتی اور بین الاقوامی اثرات کو سامنے رکھ کر بات کر رہے تھے۔میجر سعید کی اس گہری سیاسی اور دفاعی منطق نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

میں نے فائل کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے، کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر بلوچستان کے سنگلاخ پہاڑوں پر صبح کی دھوپ پھیل رہی تھی، مگر میرے دل کے اندر ایک شدید تلخی اور افسوس کا طوفان مچل رہا تھا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا، میجر سعید کی طرف مڑا اور ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیمی مگر کاٹ دار آواز

میں کہا یہی تو میجر صاحب! بالکل ادھر ہی تو ہمارا اصل مسئلہ ہے نا۔ آپ ذرا دیکھیں کہ ہم نے دن رات ایک کر کے اتنی بڑی اور سچی انویسٹی گیشن کی، اپنی جانیں داؤ پر لگائیں، اور رات آپ کی فورسز نے اتنی بڑی خفیہ کارروائی بھی کر ڈالی۔ ہمیں اچھی طرح پتہ ہے کہ اس ڈیرے پر کیا ہوتا تھا، اس کے گرفتار کارندوں (بشیر اور کامران بلوچ) نے خود اپنے منہ سے اس بات کا اقرار بھی کر لیا ہے کہ یہ سارا نیٹ ورک سردار زارق خان کا ہے، ہمیں ان گاڑیوں کا بھی پورا علم ہے کہ وہ کہاں سے لوڈ ہو کر آتی ہیں اور کس کے اشارے پر چلتی ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود، دیکھو اس نے قانون کی باریکیوں اور اپنے سیاسی اثر و رسوخ کے پیچھے خود کو کیسے محفوظ بچا کے رکھا ہوا ہے۔ وہ یہاں سے دور، اہم اور بڑے ایوانوں کے اندر آرام سے بیٹھا ہوا ہے اور ہم یہاں کھڑے مصلحتوں کا حساب لگا رہے ہیں۔ میں نے میز پر بکھرے کاغذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تلخ لہجے میں بات جاری رکھی، میجر صاحب! ہم اس وقت اس کمرے میں بیٹھ کر خود اس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہیں کہ اگر ہم اس مگرمچھ پر ہاتھ ڈالیں گے، اس پر کیچڑ اچھالیں گے یا اس پر کوئی لمبا قانونی کیس چلانے کی کوشش کریں گے، تو الٹا ہم ہی اس دلدل میں پھنس جائیں گے اور وہ اپنے پیسے اور طاقت کے بل بوتے پر صاف نکل جائے گا۔ یہ صرف ایک مجرم کی عیاری نہیں ہے میجر صاحب، بلکہ یہ ہمارے پورے نظام اور ریاستی ڈھانچے کی وہ کمزوری ہے جس کا فائدہ یہ بڑے لوگ برسوں سے اٹھاتے آ رہے ہیں۔ جب تک ہمارا قانون ان بڑے ایوانوں میں بیٹھے مجرموں کا گریبان پکڑنے کے بجائے مصلحتوں کا شکار رہے گا، تب تک عام مظلوم عوام کو سچائی اور انصاف کا یقین کیسے دلایا جا سکتا ہے؟ کمرے میں ایک سکتہ سا چھا گیا۔ شاہ میر نے گھبرا کر میری طرف دیکھا، کیونکہ ایک فوجی چھاؤنی کے اندر بیٹھ کر اس طرح کی کڑوی باتیں کرنا آسان نہیں تھا۔ لیکن میجر سعید کے چہرے پر کوئی غصہ نہیں ابھرا، وہ جانتے تھے کہ یہ ایک سچے صحافی کا وہ درد ہے جو بلوچستان کے زمینی حقائق کو دیکھ کر تڑپ اٹھا ہے۔

میجر سعید نے کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھا، پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس گئے اور باہر دیکھتے ہوئے بہت دھیمے مگر سنجیدہ لہجے میں بولے، "ذیشان... تمہاری باتیں تلخ ضرور ہیں، مگر سچی ہیں۔ نظام کی ان خامیوں اور مصلحتوں کا درد مجھ سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن یاد رکھو، ہم اسی ٹوٹے پھوٹے اور پیچیدہ نظام کے اندر رہ کر ہی اس کینسر کو آہستہ آہستہ کاٹ رہے ہیں۔ آج بھلے ہی یہ سچ میڈیا کی زینت نہ بنے، لیکن ہم تینوں نے مل کر جس طرح محنت کی اور ایک دوسرے پر جو اعتماد کیا، اسی کی بدولت ہم نے بلوچستان کو ایک بہت بڑی تباہی سے بچا کر یہاں کے امن کو قائم رکھا ہے۔

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر اچانک میرے ذہن میں ایک بات آئی۔ میں نے میجر سعید کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا، میجر صاحباس بشیر اور کامران بلوچ کا کیا بنا جنہیں ہم نے ابتدائی تفتیش کے بعد چھوڑ دیا تھا؟میجر سعید کے چہرے پر ایک گہرا اور پراسرار عزم ابھرا۔ انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا، "ذیشان، ان دونوں کی فکر تم بالکل

چھوڑ دو۔ جب میں کینٹ کے وار روم میں بریگیڈیئر صاحب کو بریفنگ دے کر عارضی طور پر آف ہونے کے لیے ادھر کوارٹر آ رہا تھا، تو میں نے راستے ہی میں اپنی ٹیم کو فائنل احکامات جاری کر دیے تھے۔ اس وقت تک فورسز کی خصوصی ٹکڑیاں حرکت میں آچکی ہوں گی اور بہت جلد وہ دونوں بھی دوبارہ ہماری گرفت میں ہوں گے۔ میجر سعید کی بات سن کر میرے چہرے پر ایک اطمینان بخش مسکراہٹ ابھری، اور کامران و بشیر کے حوالے سے جو آخری الجھن میرے دماغ میں تھی، وہ بھی دور ہو گئی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور سنجیدہ مگر انتہائی پرعزم لہجے میں کہا، ٹھیک ہے میجر صاحب ہم اس پورے معاملے کو اپنے طریقے سے مکمل خفیہ رکھیں گے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دیں گے۔ ہمارا یہ رابطہ اور ہماری یہ ملاقاتیں آئندہ بھی اسی طرح خفیہ طور پر جاری رہیں گی، اور ہم ایسے ملک دشمن نیٹ ورک کے خلاف آگے بھی مل کر کام کرتے رہیں گے تو کیا خیال ہے اب ہمیں جانے کی اجازت ہے میجر سعید نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تھکے ہوئے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا، ذیشان، تم دونوں بھی رات بھر کے جاگے ہوئے ہو اور میری اپنی آنکھیں بھی تھکن سے بند ہو رہی ہیں۔ اس حالت میں کینٹ سے باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم دونوں فی الحال یہیں کوارٹر کے اندر آرام کرو۔ ہمیں بھی شدید تھکن کا احساس ہو رہا تھا، اس لیے ہم نے میجر سعید کی بات مان لی رات بھر کا ذہنی تناؤ اور جاگنا اب تھکن بن کر پورے وجود پر حاوی ہو چکا تھا۔ ہم تینوں میں میجر سعید اور شاہ میر اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے اور جلد ہی نیند کی گہری آغوش میں چلے گئے۔

جب ہماری آنکھ کھلی، تو دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ ہم نے ہاتھ منہ دھویا اور تازہ دم ہو کر لاؤنج میں آئے۔ میجر سعید بھی وردی تبدیل کر کے عام لباس میں موجود تھے اور بالکل تازہ دم لگ رہے تھے۔ کینٹ کے آفیشل میس (Mess) سے ہمارے لیے دوپہر کا بہترین گرم کھانا آ چکا تھا۔ ہم تینوں میز پر بیٹھے کھانا کھایا اور چائے پیتے ہوئے خضدار کی مجموعی صورتحال پر غیر رسمی گفتگو کرتے رہے۔ پچھلی رات کا تناؤ اب مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک گہرا پیشہ ورانہ سکون موجود تھا۔

کھانے کے بعد، اب کینٹ سے ہماری رخصتی کا فائنل وقت ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی وہ انویسٹی گیشن فائل احتیاط سے اپنے بیگ میں محفوظ کی اور زپ بند کر دی۔ چونکہ ہمارے پاس اپنی گاڑی نہیں تھی، اس لیے میجر سعید نے کینٹ کے سیکیورٹی گیٹ کے ذریعے ہمارے لیے ایک ٹیکسی اندر منگوالی تھی۔ میجر سعید ہمیں کوارٹر سے باہر رخصت کرنے کے لیے خود اس ٹیکسی تک آئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مجھ سے اور شاہ میر سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور کہا، مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ یہ جنگ لمبی ہے، مگر ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اپنا خیال رکھنا۔ ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھے، اور وہ کینٹ کے فولادی دروازوں کو پار کرتی ہوئی ہمیں لے کر باہر خضدار شہر کی طرف بڑھ گئی۔

ساتواں باب۔۔۔۔۔۔۔واپسی کا وعدہ

شاہ میر نے خاموشی توڑتے ہوئے اہستہ سے کہا ذیشان بھائی! میں کینٹ کے اندر تو خاموش رہا، لیکن میرا دل اب بھی اس مصلحت کو قبول نہیں کر رہا۔ ہمارے پاس بشیر اور کامران بلوچ کا پورا بیان موجود ہے، ہمارے پاس اس کے نیٹ ورک کی اندرونی ڈائریاں اور رسیدیں ہیں، اور رات فورسز نے اس کے ڈیرے سے بھارتی اسلحہ بھی اپنی آنکھوں سے برآمد کیا ہے۔ اتنے پکے گواہوں اور ثبوتوں کے باوجود بھی ہم اس سردار زارق خان کا گریبان نہیں پکڑ سکتے؟
میں نے شاہ میر کی طرف دیکھا اور ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، شاہ میر! یہی تو وہ کڑوا سچ ہے جو ہمیں سمجھنا ضروری ہے۔

بات صرف قانون کی نہیں ہے، بلکہ اس طاقتور نیٹ ورک کی ہے جو اس سردار زارق خان کو بچانے کے لیے متحرک رہتا ہے۔ جیساکہ تم خود جانتے کہ زارق خان کے مہرے صرف اس کے ڈیرے پر نہیں بیٹھے، بلکہ اس کے اثر و رسوخ کی شاخیں خود ہماری حکومت کے اعلیٰ ایوانوں اور یہاں تک کہ کچھ سیکیورٹی اداروں کے اندر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر ہم اس کیس کو لے کر سیدھا عدالت جائیں، تو یہ کیس اتنا لمبا، پیچیدہ اور متنازع بنا دیا جاتا کہ سالوں کی تاریخیں پڑنے کے بعد الٹا ہم ہی مجرم ثابت ہو جاتے۔اسی لیے، ایسے مگرمچھوں کو پکڑنے کے لیے صرف روایتی قانونی جال کام نہیں آتے، بلکہ ان کے خلاف ایسی ہی خفیہ چالیں بچھائی جاتی ہیں جو ان کو اندر سے برباد کر دیتی ہیں۔ جس وجہ سے ہم نے پہلے یہ سارا کام اتنے خفیہ طریقے سے کیا، ایک ایک معلومات اور ثبوت اکٹھے کیے اور اسے یہ بڑا دھچکا دیا۔ بھلے ہی وہ اس وقت بچ نکلا ہو، لیکن ہمارا یہ مشن ختم نہیں ہوا۔

ہم دوبارہ سے، بالکل اسی طرح خفیہ چالوں کے ذریعے اس کا گھیراؤ مزید تنگ کریں گے اور اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔میں نے شاہ میر کے چہرے پر ابھرتے تاثرات کو دیکھا اور پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا، شاہ میر یاد ہے تمہیں؟ جس دن میں کوئٹہ آ رہا تھا اور ہماری وہ پہلی ملاقات ہوئی تھی، تب تم بری طرح زخمی تھے اور تمہاری حالت بہت زیادہ خراب تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر تمہیں پانی پلایا تھا اور پھر ہم دونوں ایک ہوئے تھے۔ اسی وقت ہم نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ کر یہ عزم کیا تھا کہ ہم سردار زارق خان کے اس ظلم کا بدلہ ضرور لیں گے۔ آج ذرا دیکھو... ہم نے وہ بدلہ لے لیا ہے! بھلے وہ ہتھکڑیوں میں نہ ہو، لیکن ہم نے اسے ایک ایسی زوردار اور کاری چوٹ پہنچائی ہے جو اسے عمر بھر یاد رہے گی۔

میری یہ بات سنتے ہی شاہ میر کے چہرے پر ایک والہانہ خوشی اور مسکراہٹ دوڑ گئی، اس نے جوش سے سر ہلاتے ہوئے کہا، جی ذیشان بھائی! بالکل سچ کہا آپ نے۔ یہ تو واقعی ہم نے کر دکھایا ہے میں تو مایوس ہو رہا تھا، لیکن اب مجھے اندازہ ہوا ہے کہ ہم نے اس مغرور سردار کے غرور کو مٹی میں ملا دیا ہے اور اسے ایسا نقصان پہنچایا ہے جس کا اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔

ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ اچانک میرے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی تو اسلام آباد سے میرے ایک قریبی صحافتی ساتھی کی کال تھی۔ میں نے فوراً فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے مختصر مگر سنجیدہ لہجے میں کہا گیا، ذیشان، تمہیں فوری طور پر اسلام آباد پہنچنا ہوگا۔

میں نے حیرت سے پوچھا، خیریت؟ کیا ہوا؟

اس نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا، بلوچستان کے معاملے پر ایک محدود بریفنگ رکھی گئی ہے۔ وہاں کچھ ایسی معلومات سامنے آنے والی ہیں جنہیں عام پریس بریفنگ میں نہیں رکھا جا رہا۔ چند منتخب صحافیوں کو بلایا گیا ہے

تمہاری وہاں موجودگی ضروری ہے۔ میں خاموش رہا۔ پھر میں نے پوچھا، مگر میری موجودگی اتنی ضروری کیوں ہے؟

وہ بولا، کیونکہ تم بلوچستان پر پہلے ہی کام کر رہے ہو۔ وہاں جو معلومات دی جائیں گی، ان کے کئی پہلو تمہاری فیلڈ رپورٹنگ اور تمہارے مشاہدات سے جڑتے ہیں۔ تم صرف سننے والے نہیں ہوگے، ممکن ہے تم سے کچھ باتوں کی وضاحت بھی مانگی جائے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم خود موجود رہو۔

میں نے کہا، بریفنگ کب ہے؟

اسنے جواب دیا دو دن بعد

میں نے چند لمحے سوچا اور پھر کہا، ٹھیک ہے، میں آج ہی اسلام آباد کے لیے نکلتا ہوں۔

میں نے فون بند کیا تو شاہ میر نے فوراً میری طرف دیکھا کیا ہوا ذیشان بھائی؟

میں نے گہری سانس لی اور کہا، اسلام آباد جانا پڑے گا۔ بلوچستان کے معاملے پر ایک اہم اور محدود بریفنگ ہے لگتا ہے وہاں کچھ ایسا سامنے آنے والا ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

شاہ میر نے سر ہلایا۔ تو پھر

اپکو دیر نہیں کرنی چاہیے آپ اپنا کام کریں میں یہاں سے آگے اپنے لوگوں کے پاس چلا جاؤں گا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا دل میں ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ اسے بھی ساتھ لے جاؤں، مگر حالات ایسے تھے کہ اس کا ادھر رکنا ہی بہتر تھا پھر میں نے ٹیکسی والے کو اڈے کی طرف مڑنے کا کہا ٹیکسی خضدار شہر کی مصروف سڑکوں سے گزرتی ہوئی تھوڑی ہی دیر میں مین بس اڈے (ٹرمینل) کے اندر داخل ہو گئی۔ اڈے پر مسافروں کا ہجوم، قلیوں کی آوازیں اور بسوں کے ہارن کا شور ہر طرف گونج رہا تھا، جو کینٹ کے اس پرسکون ماحول سے بالکل مختلف

تھا۔ ٹیکسی ایک طرف رکی، اور میں اور شاہ میر اپنا سامان لے کر باہر نکل آئے۔ سامنے ہی اسلام آباد جانے والی ایک بڑی لگژری بس کھڑی تھی جس کے مسافر سوار ہو رہے تھے

میں نے اپنا بیگ کندھے پر لٹکایا اور شاہ میر کی طرف مڑا۔ اس کی آنکھوں میں اب مایوسی نہیں تھی، بلکہ ایک گہرا احترام اور الوداعی اداسی واضح تھی۔ تو ذیشان بھائی... اب آپ واپس جا رہے ہیں؟ شاہ میر نے دھیمی آواز میں کہا۔ ہاں شاہ میر! میرا فی الحال (ایمرجنسی) اسلام آباد جانا بہت ضروری ہے، میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پر عزم لہجے میں جواب دیا۔ میں وہاں جاکر اس کیس کو مزید سنبھالوں گا، اس کی قانونی اور صحافتی باریکیوں پر کام جاری رکھوں گا اور یاد رکھنا میں یہاں بہت جلد واپس آؤں گا کیونکہ بلوچستان کا یہ مقدمہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ شاہ میر نے میری بات سن کر اثبات میں سر ہلایا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ہم دونوں نے آگے بڑھ کر ایک دوسرے کو گلے سے لگایا اور ایک انتہائی مخلصانہ اور جذباتی مصافحہ (الوداعی سلام) کیا اپنا بہت خیال رکھنا شاہ میر، اور الرٹ رہنا، میں نے آخری بار کہا۔

پھر میں مڑا اور بس کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مسافروں کے ساتھ بس کے اندر داخل ہو کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھا تو شاہ میر اب بھی وہیں کھڑا ہاتھ ہلا کر مجھے الوداع کہہ رہا تھا تھوڑی دیر بعد بس نے ایک زوردار ہارن دیا، اس کا انجن گرج اٹھا اور وہ آہستہ آہستہ خضدار کے اس تپتے ہوئے اڈے سے نکل کر اسلام آباد کے طویل سفر پر گامزن ہو گئی.

چند ہی منٹوں میں شہر کی عمارتیں، دکانیں اور لوگوں کا ہجوم ہماری نظروں سے اوجھل ہونے لگا، اور کھڑکی کے باہر بلوچستان کے سنگلاخ پہاڑ ایک بار پھر ہمارے ساتھ سفر کرنے لگے۔

میں نے نشست سے ٹیک لگائی، ایک گہرا سانس لیا اور خاموشی سے اپنے بیگ کو دیکھا۔ اس میں کپڑے، چند ضروری کاغذات اور میرا لیپ ٹاپ تھا، مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس چھوٹے سے بیگ میں پورے بلوچستان کا ایک بوجھ بند ہو۔

میں نے بیگ اوپر کیبن سے اتارا، گود میں رکھا، زپ کھولی اور لیپ ٹاپ نکال لیا۔ اسکرین روشن کی اور انگلیاں کی بورڈ پر رکھ دیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اسلام آباد پہنچنے سے پہلے اپنی پوری داستان کو ایک آخری ترتیب دینی ہے۔

یہ صرف ایک رپورٹ نہیں تھی۔ یہ صرف ایک انویسٹی گیشن بھی نہیں تھی۔ یہ ان لوگوں کی آواز تھی جن کے پاس اپنی آواز دنیا تک پہنچانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

میں نے سب سے پہلے ایک جملہ لکھا: یہ مقدمہ کہاں سے شروع ہوا تھا؟ اور اسی ایک سوال کے ساتھ ماضی نے دوبارہ میرے سامنے اپنے دروازے کھول دیے۔

مجھے وہ دن یاد آ گیا جب میں پہلی مرتبہ بلوچستان کی طرف روانہ ہوا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ سفر مجھے کہاں لے

جائے گا۔ میں صرف ایک صحافی کی حیثیت سے نکلا تھا، مگر راستے میں مجھے ایسے چہروں سے ملنا تھا جنہوں نے میرے اندر کے انسان کو میرے صحافتی کردار سے کہیں زیادہ جھنجھوڑ دیا۔

پھر شاہ میر کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

وہ پہلی ملاقات... اس کی زخمی حالت، وہ بے بسی، پانی کا وہ ایک گھونٹ، اور پھر وہ عہد جو ہم نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ کر کیا تھا۔

میں نے کی بورڈ پر انگلیاں تیز کر دیں اور لکھا: شاہ میر میرے لیے صرف ایک زخمی نوجوان نہیں تھا۔ وہ بلوچستان کی ایک پوری نسل کا چہرہ تھا۔ ایک ایسی نسل جو اپنے ارد گرد ہونے والی ناانصافیوں کو دیکھتے دیکھتے یا تو خاموش ہو گئی تھی، یا پھر غصے، محرومی اور انتقام کے ایسے راستوں پر دھکیل دی گئی تھی جہاں واپسی آسان نہیں رہتی۔ لیکن شاہ میر کی کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بعد میری یادیں کوئٹہ کے ان کیمپوں کی طرف چلی گئیں، جہاں لاپتہ افراد کے خاندان برسوں سے اپنے پیاروں کی تصویریں سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔

سب سے پہلے نسرین خالہ کا چہرہ میرے سامنے آیا۔ وہی تھکا ہوا چہرہ، وہی آنکھیں، جن میں برسوں سے ایک ہی سوال جما ہوا تھا:

میرا بیٹا کہاں ہے؟ میں نے آنکھیں بند کیں تو مجھے اس کا وہ چھوٹا سا گھر، اس کا خاموش صحن اور وہ خالی جگہ یاد آئی جہاں کبھی اس کا بیٹا بیٹھا کرتا تھا۔ وہ ماں جو دروازوں، تھانوں، دفتروں اور کیمپوں کے چکر لگاتے لگاتے اپنی عمر گزار چکی تھی، مگر اسے اپنے بیٹے کے بارے میں ایک سچی خبر تک نہ مل سکی۔

پھر اگلا چہرہ میرے سامنے آ گیا یوسف بلوچ کی بہن۔

وہی لڑکی جو اپنے بھائی کی تصویر کے سامنے بیٹھی تھی اور سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی:

چار سال، سات ماہ اور بارہ دن۔

اس نے یہ مدت یوں گن کر بتائی تھی جیسے اپنے بھائی کے واپس آنے کی امید میں ہر گزرتے دن کو شمار کرتی رہی ہو۔

میں سوچنے لگا، ایک بہن کے لیے اپنے بھائی کی جدائی آخر کتنی طویل ہوتی ہے؟ شاید اس درد کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کا اپنا بھائی اس سے بچھڑ جائے۔ ہر دستک پر دل کا دھڑک اٹھنا، ہر گزرتے دن یہ سوچنا کہ شاید آج وہ واپس آ جائے، اور پھر رات کو اسی خالی جگہ کو دیکھ کر سو جانا جہاں کبھی وہ بھائی بیٹھا کرتا تھا۔ کیا ایوانوں میں بیٹھا کوئی شخص اس انتظار کی شدت محسوس کر سکتا ہے؟ کیا کوئی ان چار سال، سات ماہ اور بارہ دن کا درد گن سکتا ہے؟ شاید کوئی نہیں۔

میری آنکھیں نم ہو چکی تھیں پھر لودھراں کی وہ ماں یاد آئی، کرامت کی ماں۔

وہ عورت جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بیٹے کو گولیوں کا نشانہ بنتے دیکھا تھا۔ آج بھی اس کے ہاتھ میں بیٹے کی جیکٹ تھی، مگر اس جیکٹ میں وہ بیٹا نہیں تھا جسے اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے بڑا کیا تھا۔اس کا قصور کیا تھا؟

صرف یہ کہ وہ غریب تھا، مزدور تھا اور پنجابی تھا۔

ایک ماں سے اس کے بیٹے کا خون چھیننے کا حق آخر کس نے دیا تھا۔

پھر مجھے نوشکی کا وہ بوڑھا باپ یاد آیا، بختار بلوچ۔ وہ مزدور باپ جو اپنے بیٹے کے واپس آنے کا انتظار کرتے کرتے امید سے بھی تھک چکا تھا۔ تین سال سے اس کے گھر میں ایک سوال موجود تھا، مگر جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

جس نے مجھے بڑے درد کے ساتھ کہا تھا کہ مجھے کسی پر الزام نہیں چاہیے، مجھے اپنا بچہ چاہیے۔

پھر مجھے وہ بلوچ نوجوان یاد آئے جو اپنے گھروں سے دور پہاڑوں کی طرف نکل گئے تھے۔

کچھ ریاستی جبر سے تنگ تھے۔کچھ سرداری نظام سے۔

کچھ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں سے۔اور کچھ ایسے تھے جنہیں حالات، خوف، غصے اور محرومی نے اس راستے پر دھکیل دیا تھا جس کا انجام خود انہیں بھی معلوم نہیں تھا۔

میں ان کے نظریات کا دفاع نہیں کر رہا تھا۔میں صرف یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک نوجوان آخر اس مقام تک پہنچتا کیسے ہے جہاں اسے اپنا گھر چھوڑ کر پہاڑ کو اپنا ٹھکانہ بنانا پڑتا ہے؟ کیا ہر بندوق ایک دن میں پیدا ہوتی ہے؟ یا اس کے پیچھے برسوں کی محرومی، خوف، غصہ اور ناانصافی جمع ہوتی رہتی ہے؟

میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا لیپ ٹاپ کی اسکرین پر الفاظ بڑھتے جا رہے تھے، مگر میرے سامنے اب بھی وہی چہرے تھے۔باہر سڑک پر گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ پہاڑ خاموش تھے، مگر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ان پہاڑوں کے اندر ہزاروں آوازیں دفن ہوں۔

میں نے دوبارہ کی بورڈ پر ہاتھ رکھا اور لکھنا شروع کیا۔ بلوچستان کا مسئلہ صرف چند گمشدہ لوگوں، چند لاشوں یا چند خاندانوں کی کہانی نہیں۔ اس کے پیچھے طاقت کے وہ مراکز بھی تھے جہاں فیصلے ہوتے تھے، وہ سردار اور وڈیرے بھی تھے جنہوں نے برسوں سے اپنی اپنی حدود میں اثر و رسوخ قائم کر رکھا تھا، اور وہ زمینیں اور وسائل بھی تھے جن پر عام آدمی کی نظر تو تھی، مگر اختیار کسی اور کے ہاتھ میں تھا۔ سی پیک اور ترقی کے بڑے دعووں کے باوجود اگر ایک غریب بلوچ آج بھی اپنے بنیادی حق، روزگار اور عزت کے لیے ترستا ہے تو یہ سوال صرف بلوچستان کا نہیں، پورے ملک کا سوال ہے۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا گاڑی آگے بڑھ رہی تھی۔ بلوچستان کے پہاڑ آہستہ آہستہ پیچھے چھوٹ رہے تھے،اب میں اسلام آباد کے ایوانوں کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں جہاں شاید ان پہاڑوں کی آواز کم سنائی دیتی تھی، مگر جہاں فیصلے ضرور ہوتے تھے۔ شاید وہاں کوئی دروازہ کھلے، شاید کوئی سن لے، شاید کسی ایوان میں کسی کو یاد آ جائے کہ پہاڑوں کے اُس

پار بھی انسان بستے ہیں۔
میں نسرین خالہ کا سوال، یوسف کی بہن کا انتظار، کرامت کی ماں کی خالی جیکٹ، بختار کے بوڑھے باپ کی امید اور ان بے شمار چہروں کا درد اپنے ساتھ لے جا رہا تھا جنہوں نے مجھ پر اعتماد کیا تھا۔
میں انہیں انصاف کی ضمانت نہیں دے سکتا تھا۔
کیونکہ میرے ہاتھ میں فیصلہ نہیں تھا، صرف قلم تھا۔ مگر میں ایک وعدہ ضرور کر سکتا تھا۔
میں بہت جلد واپس آؤں گا۔
اسی بلوچستان میں، انہی پہاڑوں کے درمیان، انہی لوگوں کے پاس جن کے دکھ کو میں اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا۔
اور جب واپس آؤں گا تو یہ سفر پہلے جیسا نہیں ہوگا۔ میں مزید سوال لے کر آؤں گا، مزید شواہد تلاش کروں گا، اور ان طاقتور لوگوں کے ان پردوں کو ایک ایک کر کے اٹھانے کی کوشش کروں گا جن کے پیچھے قبضے، مفادات، مراعات اور طاقت کے کھیل چھپے ہوئے ہیں۔ سردار زارق خان اور اس جیسے بڑے بڑے سردار، وڈیرے اور طاقتور لوگ شاید اپنی طاقت، اپنے اثر و رسوخ اور اپنے بنائے ہوئے حصار کے پیچھے خود کو کچھ عرصے کے لیے بچا لیں، مگر حقیقت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔
میں جانتا تھا کہ ایک صحافی کا قلم کسی کو فوراً سزا نہیں دے سکتا، مگر وہ ان سوالوں کو ضرور زندہ رکھ سکتا ہے جنہیں طاقتور لوگ دفن کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے صرف وہ دروازے کھولنے کی کوشش کی تھی جن کے پیچھے برسوں سے سوال بند تھے۔ اب ان سوالوں کا جواب دینا میرے ہاتھ میں نہیں تھا، مگر انہیں نظرانداز کرنا بھی شاید پہلے جتنا آسان نہیں رہے گا۔
اگلے دن شام ڈھلتے ڈھلتے میں اسلام آباد پہنچ چکا تھا۔ بلوچستان کے طویل سفر کی تھکن میرے جسم میں تھی، مگر ذہن اب بھی انہی چہروں اور سوالوں میں الجھا ہوا تھا۔ بس سے اترتے ہی وہاں میرے ایک صحافتی دوست میرا انتظار کر رہا تھا رسمی سلام دعا کے بعد ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔
راستے بھر اسلام آباد کی روشنیاں میرے سامنے پھیلتی رہیں۔ میں خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے تک میں بلوچستان کی سنگلاخ سڑکوں اور ان لوگوں کے درمیان تھا جن کے لیے انصاف ایک سوال بن چکا تھا، اور اب میں اس شہر میں تھا جہاں ان سوالوں کے جواب دینے والے بیٹھتے تھے تھوڑی دیر بعد ٹیکسی میرے دوست کے دفتر کے سامنے رک گئی ہم ٹیکسی سے اترے اور عمارت کے اندر داخل ہو گئے
میرے ہاتھ میں وہی بیگ تھا، مگر اب اس کے اندر صرف کاغذات نہیں تھے؛ کئی ماؤں کے سوال، کئی خاندانوں کا انتظار اور ایک پورے خطے کی خاموش آواز میرے ساتھ تھی۔
اور یوں بلوچستان کا سفر ختم نہیں ہوا تھا، بلکہ اس مقدمے کا اگلا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔

حرفِ آخر

یہ کتاب ختم ہو رہی ہے، مگر بلوچستان کا مقدمہ ختم نہیں ہوا۔
میں نے اس سفر میں جو دیکھا، جو سنا اور جن لوگوں سے ملا، ان سب کو لفظوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ چہرے ایسے تھے جنہیں شاید میں کبھی بھول نہ سکوں گا؛ وہ مائیں جن کی آنکھیں دروازے پر جمی تھیں، وہ بہنیں جو دن گنتے گنتے برسوں تک پہنچ گئیں، وہ باپ جو اپنے بیٹے کی واپسی کی امید میں بوڑھے ہو گئے، اور وہ مزدور جن کی زندگی طاقت کے بڑے کھیلوں میں کہیں بہت چھوٹی سمجھ لی گئی۔
میں نے اس کتاب میں کسی ایک فریق کو مکمل فرشتہ اور دوسرے کو مکمل شیطان بنانے کی کوشش نہیں کی۔
میری کوشش صرف یہ رہی ہے کہ سوال کو زندہ رکھا جائے۔
جہاں ریاست سے غلطی ہوئی تھی، وہاں ریاست سے سوال کرنا تھا۔
جہاں سرداروں نے عوام کے نام پر اپنے مفادات حاصل کیے تھے، وہاں سرداروں سے سوال کرنا تھا۔
جہاں شدت پسندوں نے معصوموں کو نشانہ بنایا تھا، وہاں ان کے جرائم کو بھی بے نقاب کرنا تھا۔
جہاں کاروباری مفادات نے بلوچستان کے وسائل سے فائدہ اٹھایا تھا، وہاں اس کا حساب مانگنا تھا۔
اور جہاں عام بلوچ نے سب کچھ کھو کر بھی اپنے گھر کا چراغ جلائے رکھا تھا، وہاں اس کی داستان دنیا کو سنانی تھی۔
یہ کتاب اسی سوال کا نام ہے۔
بلوچستان کا مقدمہ۔
میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اس کتاب میں لکھی گئی ہر بات آخری سچ ہے۔ ممکن ہے مجھ سے غلطیاں ہوئی ہوں، کیونکہ میں انسان ہوں، میری نظر بھی محدود ہے اور میری تحقیق بھی کامل نہیں۔ ممکن ہے کچھ سوالوں کے جواب مجھے بھی نہ مل سکے ہوں۔
لیکن ایک صحافی کی حیثیت سے میری کوشش یہی رہی کہ سوال کو سوال رہنے دوں، اسے کسی پہلے سے طے شدہ جواب میں نہ بدلوں۔
میں نے کسی کو عدالت سے پہلے مجرم قرار دینے کی کوشش نہیں کی۔ میرا کام فیصلہ سنانا نہیں تھا؛ میرا کام ان آوازوں کو سامنے لانا تھا جو اکثر طاقت کے شور میں دب جاتی ہیں۔
اگر اس کتاب میں کہیں ریاست سے سوال ہے تو اس کا مقصد ریاست کو کمزور کرنا نہیں، بلکہ اسے اس کے شہریوں

کے سامنے جواب دہ دیکھنا ہے۔ اگر کہیں سرداروں، وڈیروں یا طاقتور لوگوں سے سوال ہے تو اس کا مقصد کسی فرد سے دشمنی نہیں، بلکہ اس نظام سے سوال ہے جس میں طاقت کبھی کبھی انسان کے بنیادی حق سے بڑی ہو جاتی ہے۔ اور اگر کہیں میں نے شدت پسندی، تشدد یا بلوچ نوجوانوں کے دکھ کی بات کی ہے تو میرا مقصد کسی پوری قوم کو موردِ الزام ٹھہرانا نہیں۔ بلوچستان کسی ایک گروہ، ایک سردار، ایک تنظیم یا ایک ادارے کا نام نہیں؛ بلوچستان ان انسانوں کا نام ہے جو اس سرزمین پر اپنے خواب، اپنی محرومیاں اور اپنی امیدیں لیے زندہ ہیں۔

میں جب اس سفر پر نکلا تھا تو میرے ہاتھ میں صرف قلم تھا۔ واپسی پر میرے پاس بہت سے سوال ہیں۔

شاید ان سوالوں کے تمام جواب اس کتاب میں نہیں۔

شاید ان میں سے کچھ جواب وقت دے گا کچھ عدالتیں دیں گی کچھ تاریخ دے گیاور شاید کچھ جواب وہ لوگ دیں گے جو آج خاموش ہیں۔میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ یہ سوال زندہ رہیں۔

کیونکہ جس معاشرے میں سوال مر جائیں، وہاں انصاف کی امید بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔

اور اگراس کتاب کا کوئی ایک جملہ آپ کے ذہن میں رہ جائے تو وہ یہ ہو——

فیصلہ میرے قلم نے نہیں، وقت اور آپ نے کرنا ہے۔

میں نے صرف مقدمہ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔

جو درد دیکھا تھا آنکھوں نے، اسے لفظوں میں سجا دیا
جو سوال دبے تھے برسوں سے، انہیں دنیا کو سنا دیا
نہ تخت کی طلب تھی مجھ کو، نہ شہرتوں کا کوئی سوال
بس سچ کو سامنے لانا تھا، سو قلم اپنا اٹھا لیا
وہ ماؤں کی نم آنکھیں تھیں، وہ بہنوں کا انتظار تھا
جو درد ملا تھا راستے میں، اسے سینے سے لگا لیا
یہ سنگلاخ پہاڑ گواہ رہیں، یہ راستے بھی گواہ رہیں
میں جن لوگوں سے مل کر آیا، ان کا مقدمہ اٹھا لیا
نہ سرداروں سے خوف مجھے، نہ طاقت کا کوئی غرور
جو حق سمجھا وہ لکھ ڈالا، جو دیکھا وہ بتا دیا
اب وقت کرے گا فیصلہ، کون حق پہ تھا، کون غلط
ذیشان نے تو صرف آئینہ، تمہارے سامنے لا دیا

—— محمد ذیشان حیدر